سراپا سوال

بہت سارے معاملات میں ایک شخص کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔مگر اس کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔اسی طرح بہت سارے معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جس میں انسان بے اختیار ہوتا ہے مگر زندگی بھر وہ اس بے اختیاری کی سزا بھی بھگتتا ہے۔انسان نے کس مذہب کے گھر پیدا ہونا ہے، کس ملک،صوبے اور علاقے میں پیدا ہونا ہے ان سب چیزوں سے وہ بے خبر اور بے اختیار ہوتا ہے مگر جیسے ہی وہ پیدا ہوتا ہے اُسے تاحیات مذہب سے متعلق ردِعمل ملک اور علاقے سے متعلق ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے چاہے وہ مذہبی ہو یا نہ ہو چاہے وہ وطن پرست ہو یا نہ ہو۔ایک بچہ افغانستان میں پیدا ہوتا ہے اور ایک امریکہ میں دونوں کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔مگر دنیوی اور ابدی زندگی سے متعلق فوائد و نقصانات دونوں کے لیے یکساں ہیں۔کشمیر میں پیدا ہونے والے بچے اور تھل میں پیدا ہونے والے بچے اپنی مرضی سے وہاں نہیں آتے مگر ماحول کے مطابق ہی اب اُن کو زندگی گزارنی پڑتی ہے۔اس میں صرف ایک بات ہے کہ جب انسان شعور حاصل کرتا ہے اور کچھ بااختیار ہوتا ہے تو وہ اپنی مرضی کا مذہب اپنی مرضی کا ملک اور اپنی مرضی کا کلچر چن سکتا ہے۔یہی بات اسلم کو یورپ لے کر آئی تھی مگر یہ اُس کی خام خیالی تھی۔ویزہ کے حصول سے لے کر جرمنی کی شہریت تک وہ اپنے مذہب اور وطن کے خانے سے باہر نہ آ سکا اور جرمن شہری ہو کر بھی وہ اپنے پرانے وطن اور مذہب کی شناخت رکھتا تھا۔اس کا احساس اُسے اس وقت ہوا جب جرمنی میں دہشت گردی کے

چند واقعات ہوئے اور اُس کی کمیونٹی پر سختیاں عائد ہو گئیں۔ اُسے بھی کچھ جرمن متعصب لوگوں نے تشدد کا نشانہ بنایا۔

اسلم ایک انتہائی شریف النفس انسان تھا۔ اُس نے نہایت سادہ اور پاکیزہ زندگی گزاری تھی۔ اپنے وطن کو اس لیے چھوڑا کہ وہاں ناانصافی تھی۔ انسان کی کوئی وقعت اور اہمیت نہیں تھی۔ لوٹ مار چور بازاری اور دہشت گردی کا بازار گرم تھا۔ اسلم کا کبھی بھی ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ نہ تو مذہبی انتہا پسند تھا اور نہ ہی وطن کے معاملے میں شدت پسند۔ مگر اُسے زندگی بھر ایک ایسے خطے میں اور مذہب میں پیدا ہونے کی سزا ملتی رہی جس میں نہ تو اُس کا کچھ اختیار تھا اور نہ ہی کوئی قصور تھا۔ ہر ملک کے ایئرپورٹ پر اُس کا پاسپورٹ دیکھتے ہی اُسے علیحدہ لائن میں کھڑا کر دیا جاتا جیسے وہ دہشت گرد ہو۔ ہر جگہ اُسے امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا۔ جرمن میں ہمیشہ اُس نے صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ وہ نہایت فرض شناس تھا۔ باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرتا۔ اُس نے کبھی کوئی وائلنس نہیں کیا تھا مگر اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا تھا اُس نے اسے سراپا سوال بنا دیا تھا۔

تغیر

میں آج بستر پر کافی دیر سے لیٹی ہوئی گزشتہ زندگی سے متعلق سوچ رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی وقت گزرنے کے ساتھ جہاں سب کچھ بدل جاتا ہے وہاں سوچ، رویے یہاں تک کہ اخلاقیات بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کوئی بھی چیز مستقل نہیں۔ اگر ثبات صرف تغیر کو ہے تو پھر ان باتوں پر اتنے جھگڑے اور لڑائیاں کیوں؟ کیا ہم اتنی چھوٹی سی بات بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ماضی کے دریچوں سے ایک دریچہ کھلا اور مجھے یاد آیا کہ بچپن میں ایک شب جب میں اپنی بہنوں کے ساتھ انکل کے گھر جو کہ ان کے گھر سے ہی ملحقہ تھا تھوڑی دیر کے لیے ٹیلی ویژن پہ ڈرامہ دیکھنے کے لیے گئی تھی۔ تو ابو نے ہم سب کو ڈنڈے سے پیٹا تھا۔ ٹی وی ان دنوں نیا نیا آیا تھا اور اس کے اندر ساحرانہ کشش تھی اور وہ ہوتا بھی کسی کسی گھر میں تھا۔ ابو نے اپنے سگے بھائی سے یہ کہہ کر تعلقات منقطع کر لیے تھے کہ تم شیطانی چرخہ گھر میں لے کر آ گئے ہو۔ پھر وقت نے اپنی طاقت دکھائی ایک دن ابو خود ٹی وی گھر میں لے کر آئے۔ پھر وی سی آر، پھر ڈش لگوایا۔ پھر کیبل وقت کے ساتھ ساتھ سب بدل گیا اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر انڈین فلمیں اور انگریزی فلمیں دیکھتے تھے اور آج یہ جو موبائل میرے ہاتھ میں ہے اس میں کیا کچھ نہیں۔ صرف بیس برس میں سب اخلاقیات تبدیل ہو گئیں۔ کیا ابو اس وقت غلط تھے یا اب؟ یہ سوال ہمیشہ میرے ذہن میں رہے گا۔

یہی معاملہ حجاب اور شرم وحیا اور فیشن کا ہے۔ چند برس قبل کسی لڑکی کا بغیر حجاب کے

بازار جانا انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔اب اکیلی لڑکیاں پورے شہر میں گھومتی ہیں۔اپنے سب کام خود کرتی ہیں۔گاڑیاں چلاتی ہیں اور جس طرح کی چاہیں Dressing کرتی ہیں اوران کے والدین اکثر و بیشتر ساتھ ہوتے ہیں جو کبھی ان کو ان سب سے منع کرتے اور ڈانٹتے تھے۔مجھے یاد ہے اپنے کزنز اور منگیتر سے بھی بات کرنے پہ طوفان آ جاتا تھا اور اب اجنبی اور نامعلوم لوگوں کے ساتھ لڑکیاں گھومتی پھرتی ہیں۔غرض ماضی میں جن باتوں پر قتل ہو جایا کرتے تھے آج اُن باتوں پر تالی بجائی جاتی اور داد دی جاتی ہے۔جیسا کہ کسی لڑکی کی تعریف اگر اُس کے بھائی کے سامنے کوئی راہ چلتا آدمی کر دیتا تو اُسے غیرت کے منافی سمجھا جاتا تھا اور آج فیس بک پر لڑکیاں کیا کیا پوز بنوا کر سیلفیاں لگاتی ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں کیا کیا Comments آتے ہیں اور مزے کی بات ہے کہ ان کے بھائی اور والدین بھی ساتھ Add ہوتے ہیں۔اس سب کو قابل تحسین سمجھا جاتا ہے۔کیا یہ شرم وحیا اور بے حیائی بھی جز وقتی چیز ہے۔جو وقت اور جگہ کے ساتھ تبدیل ہوتی ہے۔جیسا کہ افغانستان میں عورت کے جسم کا کوئی حصہ اگر برقعے سے باہر ہو تو اسے بے حیائی سمجھا جاتا ہے۔تھوڑا سا ادھر KPK میں ہاتھ پاؤں نظر آتے رہیں تو خیر ہے پھر تھوڑا سا اور ادھر پنجاب میں پوری عورت حجاب سے باہر ہو تو شرم وحیا قائم ہے۔بس پیٹ ننگا نہ ہو مگر بنگلہ دیش میں ساڑھی پہنے بنگالی عورت کا پیٹ نظر آئے تو وہ بے حیائی نہیں ہے۔اسی طرح یورپ میں شرم وحیا کے معیار الگ ہیں۔ گویا یہ بھی کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

محبت

شگفتہ کی بیٹی جوان ہوئی تو اُسے بہت سے اندیشوں اور واہموں نے گھیر لیا۔ وہی اندیشے اور واہمے جو عموماً ماؤں کو بیٹیوں کے جوان ہونے پر لاحق ہوتے ہیں۔ شگفتہ کو سب سے زیادہ جس بات کا ڈر اور خوف تھا وہ یہ تھی کہ کہیں اُس کی بیٹی کو محبت نہ ہو جائے۔ وہ محبت کے بہت خلاف تھی۔ خود بھی جوانی میں اس خوفناک تجربے سے گزری تھی۔ مکمل طور پر برباد ہونے کے باعث وہ بڑی مشکل سے موت کے منہ سے واپس آئی تھی۔ اُس نے محبت میں بہت سی لڑکیوں کو اجڑتے اور برباد ہوتے دیکھا تھا اس لیے وہ اپنی بیٹی سے متعلق پیدائش سے ہی فکرمند رہی کہ وہ تب خود کو ایک کامیاب اور اچھی ماں سمجھے گی۔ جب اپنی بیٹی کو محبت سے ناسور سے دور رکھنے میں کامیاب ہوگی۔ اُس نے بچپن سے ہی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بیٹی کی تعلیم وتربیت ان خطوط پر اُستوار کی تھی کہ اُسے زندگی میں کبھی کسی لڑکے سے محبت نہ ہو پائے۔ کیونکہ اُس کا تجربہ یہ تھا کہ لڑکے محبت کے نام پر لڑکیوں کو پاگل اور بے وقوف بناتے ہیں۔ کچھ عرصہ اپنا مطلب نکالتے ہیں اُنہیں ٹشو پیپر کی طرح Use کرتے ہیں اور پھر ڈسٹ بن میں پھینک کر چلے جاتے ہیں۔ معصوم لڑکیوں کو عمروں کے روگ لگ جاتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی کی آنکھوں میں وہ کوئی محبت کے روگ کا آنسو دیکھے۔ لہٰذا اُس نے اپنی بیٹی کے دل ودماغ میں لڑکوں اور محبت کے خلاف زہر بھر دیا تھا۔ کالج تک تو معاملات درست اور ٹھیک ڈگر پہ چلتے رہے۔ کیونکہ Co education نہیں تھی مگر یونیورسٹی میں

جاتے ہی شگفتہ کو پھر سے ڈر، خوف اور اندیشے نے گھیر لیا کہ اُس کی بیٹی کہیں محبت کے چکر میں نہ پھنس جائے۔ مگر اُسے اپنی بیٹی پر اور اپنی تربیت پر مکمل اعتماد تھا۔ پھر بھی اُس نے اپنی بیٹی کی حرکات وسکنات اور روز وشب کی مصروفیات پر کڑی نظر رکھی۔ فرسٹ ایئر تو بڑی خموشی اور سکون کے ساتھ گزر گیا۔ اب تو خیر سے اُس کی بیٹی کے رشتے بھی آنے لگے تھے۔ شگفتہ بھی یہی چاہتی تھی کہ بچوں کی Arrange Marriage ہونی چاہیے۔ اُن کی پسند نہ پسند کا خیال تو رکھا جائے مگر اندھی محبت والے جذبے میں مبتلا نہ ہونے دیا جائے۔ دونوں خاندانوں کو خوب سوچ سمجھ کے دیکھ بھال کے شادی کرنی چاہیے اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد محبت ہو اور مستقبل کے منصوبہ بندی سب کچھ ہونا چاہیے۔ شگفتہ کی بیٹی کے جتنے رشتے آئے سب کو اس نے ایک ہی جواب دیا کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد تعلیم مکمل ہوئی تو شگفتہ نے شادی کے لیے اپنی بیٹی کی رضامندی چاہی مگر اُسے بیٹی کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ بات بڑھی تو پھر شگفتہ کے کانوں نے وہ کچھ سنا جس کی اسے کبھی توقع نہیں تھی۔ زندگی بھر کے تمام وہم، خوف اور اندیشے ایک پل میں اس کے اندر سما گئے اور انہوں نے خوفناک سچ کا روپ دھار لیا وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور کہتی جاتی تھی ’’خدا غارت کرے اس محبت کو‘‘

اُلجھن

عمرانہ کو خدا سے باتیں کرنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ ایک مدت تو وہ دکھوں اور تنہائی کا شکار رہی۔ پھر وہ بندوں سے مایوس ہو کر خدا کی طرف لوٹ گئی۔ گھر میں جھاڑو دیتے کچن میں سالن بناتے، برتن دھوتے، کپڑے استری کرتے یا کوئی بھی اور کام کرتے وہ خدا سے باتیں کیا کرتیں۔ مثلاً جیسے پروسن شبو کا بیٹا پیدائشی معذور تھا تو اس کا عمرانہ کو بہت غم تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اتنے خوش شکل بچے کو معذور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کہنے کو تو وہ خدا کے کاموں میں مداخلت کرتی تھی اُس کے رازوں اور بھیدوں سے ناواقف تھی۔ مگر عمرانہ کا باتیں کرنے کا انداز عاجزانہ تھا۔ اُس کے شکوے محبت بھرے ہوتے تھے۔ وہ خدا سے کہتی ''تیرے خزانوں میں کون سی کمی تھی، اپنی شبو کے بچے کو صحیح سلامت پیدا کر دیتا۔ اچھا چلو کوئی بات نہیں ''کن'' ہی تو کہنا ہے۔ میرے سوہنے کہہ دے ناں بڑی دکھی ہے بیچاری۔ شبو بچے کو دیکھ دیکھ روتی ہے۔ آنسو دیکھے نہیں جاتے اُس کے۔ دیکھ میں تیری منت سماجت کرتی ہوں کر دے ٹھیک۔ پورے محلے میں اپنے ہاتھوں سے میٹھے چاول بنا کر تیرے نام پہ تقسیم کروں گی۔''

عمرانہ ابتدا میں تو زیرِلب بڑبڑاتی تھی بعد میں رفتہ رفتہ وہ خدا سے کھل کر باتیں کرنے لگی اور اُس کی باتیں اسی نوعیت کی ہوتیں۔ ہاں اُس میں ایک بات عجیب تھی کہ عمرانہ نے اپنی ذات سے متعلق خدا سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا اور نہ ہی اپنی زندگی میں موجود کمی اور کوتاہیوں پر شکوہ کناں ہوتی تھی۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ کچھ عرصہ سے عمرانہ راہ چلتے یا پھر گہری نیند میں بھی خدا سے باتیں کرنے لگتیں۔ اب اُس کی ان باتوں پر اُس کے گھر والوں کو ہمسایوں کو اور رشتہ داروں کو حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ہاں البتہ وہ اُس کی کسی کسی بات پر چونک پڑتے تھے۔ کیونکہ وہ بات اُس کی تعلیم اور عقل وشعور سے گہری ہوا کرتی تھی جیسے اگلے روز اس نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا مجھے پتہ ہے ''تو بھی سات کے چکر میں پڑا ہوا ہے اور ہمیں بھی سات کے چکر میں ڈالا ہوا ہے۔''

اس بات پر اس کے سسر جو فلاسفی کے پروفیسر تھے چونک گئے۔ رفتہ رفتہ سب کی حیرت میں اضافہ ہور ہا تھا کیونکہ اب عمرانہ اس بات پر خوش تھی اور اس کا خوشی سے برملا اظہار کرتی تھی کہ خدا بھی اُس سے باتیں کرنے لگا ہے۔ اُس سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اُسے خدا کی آواز کبھی آسمان سے کبھی چھت یا در و دیوار سے آتی تھی۔ گھر والوں سمیت سب نے اُسے ابنارمل قرار دے دیا اور اُسے پہلے ڈاکٹروں کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹروں نے ماہرنفسیات کے پاس جانے کا مشورہ دیا مگر وہ اس کے سامنے بھی خدا سے ہم کلام رہی۔ ماہرنفسیات کی تمام تر کوششوں کے بعد بھی جب فرق نہ پڑا تو آخر اُس کے گھر والوں نے اس سے بحث میں لڑتے ہوئے کہا کہ

''خدا کیسے بول سکتا ہے؟''

تب عمرانہ نے نہایت معصومیت سے کہا ''کیوں؟ خدا گونگا ہے؟''

کب

خدیجہ بچپن سے ہی باشعور اور سمجھدار تھی۔ فطرت کچھ بچوں پر مہربان ہوتی ہے۔ خدیجہ اُن میں سے ایک تھی جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اُس کی ذہانت، بردباری اور دور اندیشی بھی سب کے سامنے کھل کر آتی گئی۔ والدین، رشتہ دار، ٹیچر سب ہی اُس کی خداداد صلاحیتوں کے قائل ہوتے گئے۔ خدیجہ نے صحافت میں ایم اے کیا۔ وہ اکثر اپنے ملک کے حالات اور لوگوں سے متعلق پریشان رہا کرتی تھی کہ ان کی حالت زار کو کیسے سنوارا جائے۔ سب سے پہلے اُس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ بنیادی مسئلہ کیا ہے۔ وہ بہت جلد اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اس کی تہہ تک پہنچ گئی۔ بنیادی مسئلہ لوگوں کو نان ایشوز میں اُلجھانا تھا۔ کیونکہ لوگ ان نان ایشوز میں پڑ کر اپنے اصل مسائل کو بھول جاتے۔ حکومت، سیاستدان، میڈیا علما سب ہی اپن اپنی جگہ پر عوام کو نان ایشوز میں اُلجھانے کا کردار بخوبی نبھا رہے تھے۔ حزبِ مخالف نے قوم کو حکمرانوں کی کرپشن کے بخار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میڈیا بھی کرپشن اور عدلیہ میں اس کرپشن کے خلاف دائر مقدمات اور سماعت کی کارروائی کے علاوہ کچھ نہیں دکھا رہی تھی۔ تجزیہ کار ٹاک شوز میں صرف اسی سے متعلق بات کرتے۔ ہر بار قوم نئی اُمید اور آنکھوں میں نئی چمک کے ساتھ منتظر رہتی۔ مگر کئی ماہ کی ریاضت کے بعد اس میں سے کچھ برآمد نہ ہوتا۔ خدیجہ اس ساری صورت حال سے بہت پریشان تھی کہ قوم کو کبھی دھرنوں کی سیاست میں اُلجھا دیا جاتا ہے کبھی عدلیہ کی آزادی کے لانگ مارچ اور کبھی اس کو کرکٹ کے بخار میں مبتلا کر دیا جاتا

ہے۔مگر اصل مسائل پر سنجیدگی سے قوم کبھی اکٹھی نہیں ہوئی۔ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ لوڈ شیڈنگ تھا۔ 15 سال سے معاشی بربادی جس کے سبب سے جاری تھی۔ اُس حوالے سے اگر کوئی بات کرتا تو اُسے ہنسی میں اُڑا دیا جاتا۔ بے روزگاری لوگوں کا مسئلہ تھا۔ بڑھتی ہوئی آبادی ملک کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔صحت عوام کا سب سے بڑا مسئلہ تھا لیکن ان مسائل پر اس طرح سے کبھی فوکس نہیں کیا گیا تھا جس طرح نان ایشوز کو فوکس کیا جاتا تھا۔خدیجہ نے عزم اور پختہ ارادہ کیا کہ وہ نان ایشوز کی بجائے اصل مسائل کی طرف قوم کی توجہ دلائے گی۔ اس عزم کے ساتھ جب اُس نے صحافت کے عملی میدان میں قدم رکھا تو اُسے اپنی برادری کے رویوں سے انتہائی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ سب پتلیاں تھیں ان کی ڈوریوں کو ہلانے والے ان دیکھے ہاتھ تھے۔ جو کہ بکاؤ تھے۔خدیجہ کو جب یہاں دال گلتی معلوم نہیں ہوئی تو اُس نے عام آدمی کو سمجھانے کی کوشش کی یعنی

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصہ کی کوئی شمع جلاتے جاتے

مگر اُس وقت اُس کی حیرت کرب میں بدل گئی جب عام آدمی بھی اپنے مسائل کی بجائے نان ایشوز کے بارے پریشان تھا اور اُن کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود خدیجہ کامیاب نہ ہوئی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ پوری قوم کی حالت ایسی بنادی گئی ہے جیسے نشہ کے عادی افراد ہوتے ہیں۔ جب تک ان کو نشہ نہ ملے اُن کی حالت غیر رہتی ہے۔ یہ عوام بھی نان ایشوز سے متعلق نشہ کے عادی بنادیے گئے ہیں۔اس لیے اصل مسائل کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا۔

تنہائی

تنہائی سمعیہ کو پسند تھی۔ جب سب اُس کے ساتھ شوہر بچے ساس سسر تو وہ تنہائی کے لمحات کے لیے ترستی تھی اور بڑی مشکل سے اگر اُسے کچھ پل میسر آتے تو وہ اُن لمحات سے خوب لطف اُٹھاتی۔ اُسے تنہائی زندگی کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہوتی۔ کیونکہ اُس میں وہ صرف اپنے پاس ہوتی۔ اس دوران اگر کوئی اُسے ڈسٹرب کرتا تو اُس کا موڈ شدید خراب ہو جاتا اور اسی وجہ سے اُس میں چڑ چڑا پن آ گیا تھا۔ ساس اور سسر اچھے تھے۔ شوہر بھی فرمانبردار تھا۔ بچوں کی تربیت بھی اُس نے بہت اچھی کی تھی۔ اس لیے سب ہی سمعیہ کے چڑ چڑے پن کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سارے گھر کی ذمہ داری کا بوجھ اکیلی بیچاری سمعیہ پہ ہے۔ لہٰذا یہ اُکتاہٹ فطری بات ہے۔ وقت کے ہزاروں روپ ہیں۔ لاکھوں رنگ ہیں اور وہ ہر لمحہ ہر پل اپنا رنگ و روپ بدلتا رہتا ہے۔ یہی اُس کی پہچان ہے اور یہی زندگی کی خوب صورتی۔ مگر خوب صورتی اور بدصورتی کا تعلق صرف احساس سے ہے۔ جب احساس بدلتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ زندگی میں کبھی سمعیہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہی تنہائی جسے وہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت سمجھتی ہے ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اُسے عذاب جاں معلوم ہوگی۔ ساس سسر کی وفات کے بعد سمعیہ کے شوہر کو بیرون ملک ایک کمپنی میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ پیکیج بہت پرکشش تھا تو وہ وہاں چلے گئے۔ جب مالی مسائل نہ رہے تو یہی فیصلہ ہوا بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیج دیا جائے۔ لہٰذا بیٹا انگلینڈ اور

بیٹی امریکہ میں چلی گئی۔ اب سمعیہ سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی۔ گھر کا کام نوکر کرتے تھے۔ وہ دن جو کبھی کام میں پلک جھپکتے گزر جاتا تا اب اُسے گزارنا پہاڑ کی طرح لگتا تھا۔ رات کو بھی نیند نہیں آتی تھی اور اُسے سونے کے لیے نیند کی گولیاں کھانا پڑتیں۔ جس شور سے اُس کی جان جاتی تھی اب وہ اُس شور شرابے کے لیے ترس گئی تھی۔ اُس کے ذہن کی یہ کیفیت ہو گئی کہ اُسے بیٹھے بیٹھے آوازیں آنا شروع ہو جاتیں۔ کمرے میں بچے آپس میں لڑ رہے ہیں اُدھر ساس آوازیں دے رہی ہے۔ سمعیہ ذرا دوائی کے لیے پانی تو لا دینا۔ اُدھر سسر تھوڑی دیر بعد آواز دیتے ہیں اِدھر شوہر کا فون کہ دوستوں کے ساتھ گھر آ رہا ہوں چائے بنا دو۔ یہ سب آوازیں آپس میں یکجا ہو جاتیں اور سمعیہ ایک ایک آواز کو کئی بار سننا چاہتی۔ اپنے کانوں کے راستے جسم کے اندر جذب کرنا چاہتی کہ ان آوازوں میں اس کی زندگی تھی۔ مگر اچانک یہ سب آوازیں خاموشی میں بدل جاتیں۔ پھر یہ خاموشی کے لمحے طویل تر ہوتے جاتے۔ یہاں تک کہ سمعیہ چیخ چیخ کر کہنے لگتی:

مجھ کو تنہائی کا احساس نہ ہو
اس قدر شور مچایا جائے

آ گہی کا عذاب

اک انجانا خوف رابعہ کے اندر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ بچپن میں تو اُسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ جن چیزوں سے بچے ڈرتے تھے مثلاً کاکروچ، چھپکلی یا مینڈک وہ انھیں ہاتھ میں اُٹھا لیتی تھی۔ اندھیرے میں وہ کمرے میں اکیلی لیٹی رہتی کبھی اسے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا لیکن جیسے جیسے رابعہ بڑی ہوتی گئی اک انجانا ڈر بھی اس کے اندر جوان ہوتا گیا۔ اب وہ ۲۰ برس کی ہوگئی تھی اور یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ مگر ہر وقت ایک انجانے خوف اور ڈر کے حصار میں رہتی تھی۔ وہ کمرے میں بیٹھی ہوتو اُسے لگتا تھا دریچوں کے پردے جو ذرا ذرا سے ہل رہے ہیں اُن کے پیچھے کوئی ہے۔ وہ بہت گھبرا جاتی اور ڈرتے ڈرتے دریچوں کے پاس آتی۔ پردے ہٹا کر دیکھتی مگر وہاں کوئی نہ ہوتا۔ اُسے لگتا صوفے کے پیچھے کوئی چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ دبے پاؤں صوفے کے پاس آئی۔ جھانک کر دیکھتی تو وہاں کوئی نہ ہوتا۔ اس سے وہ شدید ذہنی اذیت کا شکار ہو رہی تھی۔ کمرے میں جب وہ آرام کرسی پر لیٹی ہوتی اُسے لگتا جیسے کوئی اُس کے پیچھے کھڑا ہے جو ابھی اُس کا گلا دبا دے گا۔ اس طرح راہ چلتے بھی ہر وقت اُسے یہ احساس دامن گیر رہتا کہ کوئی مسلسل اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ لہٰذا بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنا اُس کی عادت بن گیا تھا۔ جس سے کئی لوگ جو اُس کے پیچھے ویسے آ رہے ہوتے غلط فہمی کا شکار ہو جاتے۔ وہ اپنے اس انجانے خوف سے بہت تنگ تھی۔ اس سے اُس کی تعلیم اور زندگی کے معمولات درہم برہم ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس نے اپنے ممی پاپا کو بتایا پہلے تو انھوں نے

اس بات کو اہمیت نہیں دی اور ویسے ہی گفتگو میں سمجھایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں صرف تمہارا وہم ہے۔ رابعہ کا مذاق بھی اُڑایا جیسا کہ اُس کے دوست اُڑاتے تھے۔ بعد میں جب وہ ایک دوبار بے ہوش ہوگئی تو وہ ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر کی ادویات سے جب فرق نہ پڑا تو کسی نے ماہرنفسیات کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔

ماہرنفسیات نے رابعہ کی سرسری بات سنتے ہی کہا کہ آپ کوئی پہلی مریضہ نہیں ہیں یہ بیماری بچوں بڑوں کا خاص کر حساس لوگوں میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس کی وجہ شہر میں ہونے والے آئے روز بم دھماکے، موت کی خبریں، قتل وغارت، چوری ڈکیتی کی وارداتیں اور گھناؤنے جرائم ہیں جو کہ لاشعور میں داخل ہو کے نفسیاتی مسائل کا شکار کر دیتے ہیں۔ رابعہ صحافت میں ایم اے کر رہی تھی اس لیے ملکی اور بین الاقوامی حالات سے آ گاہی اُس کی تعلیم کا حصہ تھی اور ڈاکٹر ز نے اسے خبر سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔

یہاں جتنے مسائل ہیں وہ سارے آ گہی کے ہیں
یہاں میں ہر خبر سے بے خبر جاؤں تو اچھا ہے

شی میلی

یہ تم نے کیا کر دیا کاشف !علینا کاشف کا گریبان پکڑ کر زور زور سے چلاّ رہی تھی۔ اُس پہ ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ کاشف ساکت کھڑا تھا۔ پستول سے نکلی گولی کی سنسناہٹ ابھی تک فضا میں گونج رہی تھی۔

کاشف نے علینا کی بہن سوہا کا قتل کر دیا تھا۔ اپنی زندگی، اپنی خواہشات کا قتل کر دیا تھا۔ سوہا اُسے جان سے بھی عزیز تھی۔ اُس کے ساتھ اس نے زندگی کو جینا سیکھا تھا۔ سوہا کی سانسوں کے ساتھ کاشف کی سانسیں چلتی تھیں لیکن آج وہ پاگل ہو گیا تھا۔ وہ سوہا سمیت ساری کائنات کو تہس نہس کر دینا چاہتا تھا۔

اُس نے سوہا کو جی جان سے چاہا۔ ساری دنیا چھوڑ کر اسے اپنی زندگی بنایا۔ آخر اُس کا قصور کیا تھا۔ صرف یہ کہ وہ اسے اپنانا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا تھا۔ ساری زندگی اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ اس معاشرے میں تو اکثر مرد محبت کا کھیل کھیلتے ہیں۔ وقت گزاری کرتے ہیں اور پھر کئی مجبوریوں کا عذر تراش کر عورت کو بیچ راہ میں اکیلا چھوڑ کر نئے رستوں کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔

کاشف ایسا نہیں تھا۔ اُس نے ہمیشہ سوہا کے ساتھ زندگی کے کٹھن رستوں پہ ایک ساتھ چلنے کے خواب دیکھے تھے۔

لیکن بے وفا تو سوہا بھی نہ تھی۔ کاشف کی سانسوں کے ساتھ اُس کی بھی سانسیں چلتی تھیں۔ دن رات صبح و شام وہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے۔ اظہارِ محبت

کرتے۔

اب جب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اپنا لیں سوہا لگا تار اُسے نظر انداز کر رہی تھی۔

کاشف نے جیسے ہی سوہا کو پرپوز کیا سوہا ایک دم پھٹ پڑی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کاشف۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔

تو کیا تم میرے جذبات میری زندگی کے ساتھ ایک کھیل کھیل رہی تھی؟ تم مجھے بے خوف بنا رہی تھیں۔

میں کچھ نہیں جانتی کاشف۔ لیکن میں شادی نہیں کر سکتی۔ کاشف کے ارد گرد گویا بے شمار دھماکے ہوئے۔ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔

اُس کے ذہن میں پختہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ سوہا نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ وہ اُس کے ساتھ وقت گزاری کرتی رہی ہے لیکن شادی کے لیے کسی اور کو منتخب کیا ہو گا۔

نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ وہ میری نہیں تو کسی اور کی بھی نہیں ہو سکتی۔

کاشف نے اپنا ریوالور نکالا اور سوہا کے گھر پہنچ گیا۔ دونوں کے والدین کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور دونوں بہنیں گھر پہ اکیلی تھیں۔ علینا سوہا سے بڑی تھی اور کاشف اور سوہا کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔

سوہا کہاں ہے؟ کاشف نے اندر آتے ہی پہلا سوال کیا۔ اپنے کمرے میں ہے۔ تم بیٹھو وہاں۔ میں تم دونوں کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔

ابھی وہ کچن میں چائے کا پانی چولہے پر رکھ ہی رہی تھی کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔

وہ دوڑتی ہوئی سوہا کے کمرے میں پہنچی۔ سوہا کی خون میں لت پت لاش فرش پر پڑی تھی۔

یہ تم نے کیا کر دیا کاشف۔ علینا اس کا گریبان پکڑے پاگلوں کی طرح چلاّ رہی تھی۔

سوہا نے مجھے سب بتا دیا تھا کاشف۔ وہ بے وفا نہیں تھی۔ وہ بے وفا نہیں تھی۔ ٹوٹ کر چاہتی تھی تمہیں بے پناہ پیار کرتی تھی تم سے۔

لیکن اُس کی ایک ہی خطا تھی۔ وہ کبھی تمہیں یہ بتانے کی جرات نہ کر سکی کہ خوبصورت خدوخال اور جسامت والی جس لڑکی سے تم بھی پیار کرتے ہو وہ لڑکی نہیں شی میل ہے۔

بے وفائی

راحیل شادی کے بعد اتنا بدل جائے گا اُسے اندازہ نہیں تھا۔ افشاں ابھی ابھی اُس عمر میں داخل ہوئی تھی جہاں آنکھوں میں سوائے خوابوں کے دوجا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ ماں کی بے وقت موت کے بعد باپ نے اُس کی جلد شادی کر دی تھی۔

اب راحیل ہی اُس کا شوہر تھا۔ اُس کا دوست بھی اور محبوب بھی وہی تھا۔

چند مہینوں تک وہ ایک پیار کرنے والا جوڑا بنے رہے۔ جنہیں باقی دنیا سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ ہر وقت ایک دوسرے میں مگن رہتے۔

بہت جلد وہ دونوں دو بیٹوں کے والدین بن گئے۔ زندگی کے ماہ و سال تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ افشاں کی اُمنگیں ابھی جوان تھیں اور وہ خود بھی۔ لوگ اکثر یہ ماننے سے انکار کر دیتے کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔

راحیل بزنس بڑھانے کے چکر میں دن رات مصروف رہنے لگا تھا۔ گھر اور بچوں کی ساری ذمہ داری افشاں پر آن پڑی تھی۔ سارا دن گھن چکر بنی رہتی لیکن شام ہوتے ہی شوہر سے دو باتیں کرنے کو بھی ترس جاتی۔ راحیل سے اس کی کئی کئی دن بات نہ ہو پاتی۔

اُسی دوران راحیل کی غیر موجودگی میں راحیل کے کزن فیاض کی گھر میں آمد و رفت بڑھنے لگی تھی۔ فیاض نہ صرف خوش شکل تھا بلکہ خوش اخلاق بھی۔ اُس کی زندگی بھری باتوں سے افشاں کو بھی زندگی ملنے لگی تھی۔

اُسے فیاض کا انتظار رہنے لگا۔ دوریاں گھٹنے لگی تھیں۔ آج تو گویا تمام فاصلے مٹ

گئے۔ وہ دونوں خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

اگلے روز راحیل گھر آیا تو افشاں کی اپنے شوہر سے نظریں ملانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ یہ احساس اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ اُس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہے۔

راحیل نے آ کر پیار سے اُس کے گال کو چھوا تو یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر گیا۔افشاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارے کیا ہوا؟ راحیل نے پیار سے اس کا چہرہ تھاما۔

کچھ نہیں بس آپ کی بہت یاد آ رہی تھی آج۔

راحیل مسکرا دیا۔ میں ہوں ناں ہر وقت تمہارے ساتھ۔ ابھی نہا کے آتا ہوں تو باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔

راحیل واش روم میں تھا اور اُس کے موبائل پر بار بار میسج ٹون بج رہی تھی۔

پہلے تو افشاں نے توجہ نہ کی۔ پھر بار بار کی ٹون نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سیل میں ان باکس کھولتے ہی اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ کسی لڑکی کے پیغامات تھے جس میں شدتِ جذبات کا بھرپور اظہار کیا گیا تھا۔

اور کل رات گزرنے والے قربت کے لمحوں کا بار بار بے تابی اور جذبات کے ساتھ اظہار کیا گیا تھا۔

افشاں کو لگا اُس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ ایک طوفان سا آ کے گزر گیا۔

لیکن نجانے کیوں اپنے گناہ کی شدت کے احساس میں کمی آ گئی۔ اُس نے خود کو سنبھالا اور راحیل کے ساتھ باہر جانے کے لیے اپنی وارڈ روب سے لباس کا انتخاب کرنے لگی۔

امیج

ثانیہ: تنزیلہ یار یہ جھوٹ بڑے کمال کی چیز ہے بلا وجہ اس بے چارے کی اتنی مخالف ہو میرے تو دن میں کئی کام اور پرابلمز صرف اس کی وجہ سے Slove ہوتی ہیں ورنہ میں تو ماری جاؤں۔

تنزیلہ: ثانیہ کی بچی وقتی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے مگر In Future اس کے بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اگر ایک بار بندہ جھوٹا ثابت ہو جائے تو اُس کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔اعتبار ختم ہو جائے تو پھر نا قابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔

ثانیہ: یار ایسا ویسا کچھ نہیں ہوتا بس بندے کو ہر کام کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے چاہے وہ اچھا ہو یا برا مجھے دیکھو دس سال سے سب کو الو بنا رہی ہوں جو بھی اُلٹے سیدھے کام کرتی ہوں سچ بتا دوں تو قتل ہو جائے۔مرے جھوٹ نے سب عیب چھپا رہے ہیں۔سو اس سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں میرا۔خود کو دیکھو سچ بول کے بھی کئی بار رُسوا ہوئی ہو۔تمہارے سچ پر بھی کبھی کبھی کوئی اعتبار نہیں کرتا۔

تنزیلہ: ہاں مگر ثانیہ مجھ سے جھوٹ بولا نہیں جاتا۔میرا یہی سچ ہے۔

ثانیہ: اور یہ خوشامد بھی کیا غضب کی چیز ہے یار۔تھوڑا سا مکھن لگاؤ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ڈیڈی کی خوشامد کر کے جتنے مرضی پیسے لے لو۔ممی کی خوشامد کر کے جو بات منوانی ہے منوا لو۔باس کی خوشامد کر کے اپنی من پسند ڈیوٹی لگوا لو یا چھٹی لے لو۔ترقی کا ہر راستہ اور آسائش کا ہر سامان صرف خوشامد کے اندر مضمر ہے۔ویسے تنزیلہ آج

تم بڑی خوبصورت اور پیاری لگ رہی ہو۔کیا بات ہے۔

تنزیلہ: مجھ سے مار کھاؤ گی ۔میری خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں ۔ میں تمہاری نیچر کو سمجھتی ہوں مجھ سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا اور خوشامد سے بندے کی Personality میں شان وشوکت اور رعب نہیں رہ جاتا اور انا بھی مجروح ہوتی ہے۔

ثانیہ: ہاہاہاہا تنزیلہ نا کام ہونے والی ساری خصوصیات تم میں ہیں۔ میں پریشان ہوں آج کے دور میں تمہارے جیسی سیدھی لڑکی کا کیا بنے گا۔

اتنی دیر میں ثانیہ کا فون بجتا ہے۔ثانیہ پاپا میں آفس میں ہوں آج بہت کام ہے ذرا لیٹ آؤں گی ۔ پاپا آج آپ کی آواز بہت پیاری لگ رہی ہے۔میرے سارے دن کی تھکن دور ہوگئی۔Take Care Papa Love u فون بند ہو جاتا ہے۔دیکھا تو تنزیلہ کی بچی کیسے پاپا کوخوش کیا ہے کچھ سیکھ لو اُلو!

تنزیلہ: ممی میں اپنی دوست ثانیہ کے کے ساتھ ادھر ایک کافی شاپ میں ہوں ۔اچانک فون بند ہو جاتا ہے اور تنزیلہ اُداس ہو جاتی ہے۔

ثانیہ: کیا کہہ رہی تھی ممی؟ اتنی اُداس کیوں ہوگئیں؟

تنزیلہ: (سچ بولتے ہوئے) ممی کہہ رہی تھیں ثانیہ جیسی گھٹیا لڑکی کے ساتھ گھومتے شرم نہیں آتی ۔گھر آؤ میں تمہاری خبر لیتی ہوں۔

توازن

سحر کو سوسائٹی میں مرد اور عورت کے فرائض میں غیر منصفانہ تقسیم پر ہمیشہ دکھ اور غصہ آ تا تھا مگر سب سے بڑی دکھ کی بات اُس کے لیے یہی تھی کہ وہ اس ناانصافی پر احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے کے بعد اُسے گھر کے سب لوگوں کے لیے ناشتہ تیار کرنا ہوتا تھا۔ اس دوران گھر میں افراتفری کا عالم ہوتا۔ بچوں کو اسکول کے لیے بھی سحر نے تیار کرنا ہوتا تھا۔ اپنے شوہر کے دفتر کی تیاری میں بھی اُس کو کپڑے اِستری کرنے سے لے کر جوتا پالش کرنے تک سب کام کرنے ہوتے۔ اس دوران ساس اور سسر کی آواز پر بھی اُسے دوڑ کے جانا پڑتا۔ ان تمام بکھیڑوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے آفس سے لیٹ ہو جاتی جس کی وجہ سے اُسے باس سے بھی باتیں سننا پڑتیں۔ گھر والوں کی طرح باس کو خوش کرنے کے لیے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا۔ واپسی پر گھر میں کھانا پکانا بچوں کو پڑھانا گھر کے دیگر کام صفائی، کپڑے دھونا وغیرہ بھی اُسی کے ذمے تھا اور اس طرح رات کا ڈنر اکثر اُس کے شوہر دوستوں کے ساتھ گھر آ جاتے تو کھانا زیادہ بنانا پڑتا۔ اسی طرح رات گئے تک سحر کے کام ختم نہ ہوتے تھے اور بستر پر بھی اسے اپنا فرض نبھانا ہوتا تھا۔ ظلم یہ تھا کہ یہ سب کام اسے خندہ پیشانی سے کرنا پڑتے۔ اگر تھوڑا سا بھی ماتھے پہ بل آتا تو اُسے بہت کچھ سننا پڑتا۔ لہٰذا اب وہ اس تمام صورت حال کی عادی ہو چکی تھی لیکن کبھی کبھی اس غیر منصفانہ تقسیم پر اس کا دل بہت کڑھتا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سر بہ سجود ہو کر خوب روتی۔ کیونکہ شکوہ کا اختیار تو اُسے یہاں بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو

اُس کا دل کرتا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جائے۔کوئی ایسا گوشہ عافیت ہو جہاں وہ پرسکون کچھ دن زندگی کے گزار سکے۔مگر وہ ایسا کیسے کرسکتی تھیی۔اپنے بچوں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔اس اذیت ناک ماحول میں اسے اچانک ایک ترکیب سوجھی اور جیسے اس کی تلخ زندگی میں بہار آ گئی۔جب بھی اُسے کچھ فرصت کے لمحات ملتے وہ آنکھیں بند کر کے اپنے بچپن میں لوٹ جاتی جہاں اُس کا گھر ہوتا ماں ہوتی جو اُسے کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ باپ کی شفقت ہوتی جو اُس کی ہر وقت فرمائشیں پوری کرتے۔بہنوں اور بھائیوں کا پیار ہوتا جو کہ سب ہی سحر پر جان نچھاور کرتے۔فرصت کے چند لمحوں میں یہ خوبصورت یادیں دن بھر کی تھکن اُتارنے کے لیے کافی ہوتیں۔اُس نے اب ان ماضی کی یادوں میں جینا سیکھ لیا تھا۔

نااہل

کمال صرف نام کا کمال تھا۔ کمال نام کی کوئی خوبی اس میں نہیں تھی۔ وہ شریف تھا ایمان دار تھا، محنتی تھا مگر باصلاحیت نہیں تھا۔ بچپن سے ہی نالائق تھا۔ اس کی تعلیم پر جس قدر محنت کی گئی سب رائگاں گئی۔ کیونکہ دماغ نام کی کوئی چیز اُس کے اندر نہیں تھی۔ اس وجہ سے اسے بہت مار پڑتی، بہت گالیاں سننا پڑتیں۔ مگر وہ لاکھ کوشش کے باوجود خود کو Improve نہیں کر پاتا تھا۔ وہ رو رو کر فریاد کرتا تھا کہ اس میں اُس کا کیا قصور ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے عقل نہیں دی تو اس میں اس کا کیا دوش۔ وہ اپنی طرف سے تو پوری محنت اور کوشش کرتا ہے مگر کچھ بن نہیں پڑتا تو اُسے کیوں ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اکثر وہ اللہ تعالیٰ سے بھی فریاد کناں ہوتا کہ مجھ پر یہ ظلم کیوں؟ میرے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟ مجھے تھوڑی سی عقل اور دیتے تو مجھ پر جگ ہنسائی نہ ہوتی۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا وہ ایک مزاحیہ کردار بنتا گیا۔ گھر والے تو اس کی حالت دیکھ کر دکھی ہوتے مگر رشتہ دار محلے والے اور باقی لوگ اُسے چھیڑ چھیڑ کر خوب لطف لیتے۔ وہ بھی ان کی باتوں سے چڑ جاتا اور گالیاں دیتا۔ مگر اس کی گالیوں کا کوئی برا نہیں مناتا تھا۔ بلکہ سب Enjoy کرتے تھے۔ کبھی کبھار تو کمال کو غصہ آتا اور وہ چھیڑنے والے کے پیچھے دوڑ پڑتا تاکہ اسے پکڑ کر زدوکوب کر سکے اور اپنا بدلہ چکا سکے۔ مگر بدلہ چکانے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ کیونکہ وہ زندگی کے باقی کاموں کی طرح اس میں بھی نااہل تھا۔ یہ نااہلیت اس کے لیے طعنہ بن چکی تھی۔ حالانکہ وہ اندر سے مکمل باشعور اور حساس تھا۔ مگر اُس کی فطری کمزوری

نے اُسے گھر میں اور دنیا میں ایک تماشا بنا دیا تھا۔ اپنے طور پر بھی وہ جو اچھا کرنے کی کوشش کرتا وہ غلط ہو جاتا اور اُس کو اس کے ناکردہ گناہ کی مکمل سزا ملتی۔ کمال کے گھر کے قریب گندا نالہ تھا۔ ایک دن وہ گھر سے باہر نکلا تو لوگوں کا ہجوم اور شور وغل دیکھا۔ وہ وہاں پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ دو بچے نالے میں گر گئے ہیں۔ مگر کوئی بھی گندے اور خطرناک نالے میں جانے کو تیار نہیں تھا۔ سب ریسکیو کا انتظار کر رہے تھے۔ جبکہ بچے چیخ رہے تھے۔ بچاؤ بچاؤ اور روئے جا رہے تھے۔ ہر لمحہ وہ نالے میں دھنستے جا رہے تھے۔ کمال بغیر سوچے سمجھے نالے میں اُتر گیا۔ لوگوں کے لیے منظر نہایت حیران کن تھا۔ کمال بڑی مشکل سے بچوں تک پہنچا۔ لوگوں نے اس کی طرف رسی پھینکی۔ ایک بچے کو اس نے وہ رسی چاروں طرف سے لپیٹ کر باندھ دی اور لوگوں نے اسے کھینچ لیا۔ دوسرے بچے کو کمال نے بڑی مشکل سے باہر کھینچا۔ اُس وقت تک وہ خود بھی کافی دھنس چکا تھا۔ دوسرے بچے کو مکمل رسی باندھنے تک 90% وہ کیچڑ میں دھنس چکا تھا۔ جب دوسرا بچہ باہر آیا تو کمال ڈوب چکا تھا۔ مگر اس وقت ہر آنکھ اشک بار تھی زندگی بھر نکما، نالائق اور نااہل کہلائے جانے والے کمال نے ثابت کر دیا تھا وہ نااہل نہیں تھا بلکہ باکمال تھا۔

سوزی

چڑیا گھر کی ہتھنی سوزی کی موت چڑیا گھر انتظامیہ کے لیے دکھ بھری خبر تھی مگر ہتھنی کے ساتھ ڈیوٹی پر مامور جبار کی تو جیسے دنیا اُجڑ گئی تھی۔ دس برس کا ساتھ کوئی معمولی نہیں تھا۔ جبار کو وہ دن یاد آ رہا تھا جب اُسے Zoo میں جاب ملی تھی۔ انہی دنوں میں سوزی کو افریقہ سے لایا گیا تھا۔ اُس کے چڑیا گھر میں آنے سے خوب رونق لگ گئی تھی۔ کیونکہ بچوں کی توجہ کا مرکز سوزی ہی ہوا کرتی۔ وہ بہت جلد اس کے ساتھ مانوس ہو گئی تھی اور چڑیا گھر میں زندگی گزارنے کے اصول وقواعد بڑی آسانی سے سیکھ گئی تھی۔ اُس نے جنگل کی زندگی کو یکسر فراموش کر دیا۔ اُس کی چال سے یوں لگتا جیسے وہ چڑیا گھر کو ہی اپنا مسکن سمجھتی ہے۔ بچوں اور بڑوں کی توجہ کا مرکز ہونے کے باعث اس میں تھوڑا سا غرور بھی پیدا ہو گیا تھا جس کا مظاہرہ وہ چڑیا گھر میں چلتے وقت کیا کرتی۔ اُس نے بچوں سے اپنی سونڈ کے ذریعے نوٹ لینے کا فن بھی بڑی آسانی سے سیکھ لیا تھا۔ نوٹ کی ساری آمدنی سیدھی جبار کی جیب میں جاتی۔ اس میں سوزی کا کوئی حصہ نہ ہوتا۔ حالانکہ ساری محنت سوزی کی ہوا کرتی تھی۔ جبار سوزی کے آنے سے کافی خوش حال ہو گیا تھا اور اُس نے سوزی سے مستقبل میں بھی بہت سی اُمیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ چڑیا گھر میں اکیلی ہتھنی ہونے کے باعث وہ بہت موڈی اور لاڈلی بھی تھی۔ پتہ نہیں کیوں چڑیا گھر انتظامیہ نے کوئی ہاتھی Zoo میں رکھنے کا انتظام نہیں کیا۔ ورنہ اس کے بچے پیدا ہونے سے چڑیا گھر کی رونق اور Income میں بھی خاطرخواہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ Zoo کی

Income میں تو سوزی کی آمد سے بھی کافی اضافہ ہوا تھا۔مگر انتظامیہ کی طرف سے بے اعتنائی کی وجہ سے سوزی Uric Acid جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوگئی۔ بیماری کے بعد بھی اُس کے علاج کی طرف خصوصی توجہ نہ کی گئی جس کی وجہ سے اس کی صحت گرتی چلی گئی اور بالآخر وہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ جبار کو اپنے مستقبل کے حوالے سے لاحق خدشات نے گھیر لیا۔ چڑیا گھر انتظامیہ کو جان کے لالے پڑ گئے کہ اگر انکوائری ہوئی تو غفلت برتنے کے جرم میں ان کو سزا ہوگی۔سوزی کی موت کا اصل دکھ بچوں کو ہوا ان پر یہ خبر قیامت بن کر ٹوٹی اور انہوں نے سوزی کی یاد میں رو رو کر اپنا حال برا کر لیا۔شہر میں شاید ہی کوئی بچہ ہو جس کی تصویر سوزی کے ساتھ نہ اُتری ہو۔لہٰذا چیئرنگ کراس پر شہر کے تمام بچوں نے سوزی کی یاد میں شمعیں جلائیں اور اُس کے ساتھ کھینچی گئی تصاویر کی نمائش بھی لگائی۔

بھتہ

مسجد کی سیڑھیوں میں بیٹھے اسلم اعجاز کے لیے اذان کی آواز کسی رزق سے کم نہیں تھی۔ مگر یہ رزق نمازیوں کی طرح روحانی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ اسلم اعجاز گزشتہ دس برسوں سے ان سیڑھیوں میں بیٹھا تھا اور اب ان سیڑھیوں کا ہی حصہ لگتا تھا۔ نماز کے لیے آنے والے بھی معمول کے مطابق وہی تھے اور اسلم اعجاز بھی وہی۔ لہٰذا وہ معمول کے مطابق سکے اسلم اعجاز کے آگے پڑے برتن میں ڈالتے رہتے۔ کبھی کبھار کوئی دس یا بیس کا نوٹ بھی نظر آ جاتا۔ اسلم کا حلیہ اگرچہ مولویوں جیسا تھا۔ لمبی داڑھی سر پر ٹوپی شلوار ٹخنوں سے اوپر۔ پھر بھی اُس نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ وہ صبح کی اذان کے ساتھ جاگتا اور مسجد کی سیڑھیوں میں آ کر بیٹھ جاتا اور عشا کی نماز کے بعد دن بھر کی جمع پونجی لے کر حبیب بینک بلڈنگ سے ملحقہ فٹ پاتھ پر سونے کے لیے چلا جاتا۔ دن بھر اتنی ریز گاری اکٹھی ہو جاتی کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکے۔ یوں تو وہ اپنا زیادہ تر وقت بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر گزارتا تھا اور پتہ نہیں کیا کیا ان کے بارے میں سوچتا رہتا تھا لیکن اُس نے خواتین کو کبھی ہوس بھری نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اگر اُس کی نظروں نے کسی خاتون کا تعاقب کیا بھی تو آہ کے ساتھ ایک حسرت کے ساتھ۔ ہاں البتہ بچوں کو دیکھ کے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی جیسے اندھیری گلیوں میں کوئی لال ٹین اُٹھائے پھر رہا ہو۔ اسلم اعجاز کو راہ چلتے کتوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ جیسے ہی کوئی کتا مسجد کے پاس سے گزرتا اسلم اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں چھپنے کی کوشش کرتا اور سیڑھیوں

میں دُبک جاتا۔مگر آج تک کسی کتے نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور نہ ہی بھونکا۔ اسلم اعجاز روایتی فقیر نہیں تھا حادثاتی فقیر تھا۔ وقت اور حالات نے اسے یہاں لا کھڑا کیا تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں یہی کوئی دس برس قبل وہ کراچی کی ایک مارکیٹ کا نامور تاجر تھا۔ اس کا کاروبار کروڑوں میں تھا اور کروڑوں میں سے وہ لاکھوں خدا کی راہ میں دل کھول کر خرچ کر دیا کرتا تھا۔ وہ باقاعدگی سے پانچ وقت نماز پڑھتا اور بیوی بچوں کو بھی اس کا عادی بنا چکا تھا۔ اُس کے در سے کوئی فقیر خالی نہیں گیا تھا۔ مسجد کے باہر بیٹھے فقیروں کو وہ بن گنے نوٹ دیا کرتا تھا اور اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرتا۔ اُس نے ہمیشہ اللہ سے ایک دعا مانگی کہ اس کا گھر اور بیوی بچے محفوظ رہیں۔ کیونکہ شہر کے حالات بہت دگرگوں تھے۔ پھر وہی ہوا جس کا اُسے ڈر اور خوف تھا۔ ایک Unknown کال سے اُسے بھتہ دینے کے لیے کہا گیا جو کہ اُس کے وہم وگمان سے بہت زیادہ تھا۔ بات بات میں بات بڑھ گئی۔ اسلم اعجاز کو غصہ آ گیا۔ اُس نے بھتہ دینے سے انکار کر دیا۔ اگلے روز وہ دفتر میں بیٹھا تھا کہ اُس کے ہمسایوں نے کال کر کے اُسے بتا دیا کہ چند نامعلوم افراد نے اُس کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا ہے۔ جب وہ گھر پہنچا تو اپنے بیوی بچوں کے نقشے خون میں لت پت دیکھ کر حواس کھو بیٹھا۔ جب ہوش آیا تو ہسپتال تھا۔ واپس وہ اپنے گھر نہیں گیا اور نہ ہی کاروبار کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ کراچی سے دور پنجاب کے ایک شہر میں آ کر اس مسجد کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا اور اُس نے اللہ سے کہا اب میں تجھ سے اپنا دیا ہوا بھتہ واپس لوں گا۔ کیونکہ تو نے میرے بیوی بچوں کی حفاظت نہیں کی۔ میں نے جو پیسے تیری راہ میں خرچ کیے اگر وہ قاتلوں کو دیے ہوتے تو آج ایسا وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ لہٰذا اب اسلم اعجاز مسجد کی سیڑھیوں میں بیٹھا سکہ سکہ اپنے پیسے واپس لے رہا تھا۔

گشتی

پولیس کئی ماہ تک سائرہ کی خودکشی کی وجہ جاننے میں ناکام رہی تھی اور نہ ہی اس کے گھر والوں کو پتہ چل سکا تھا۔ سائرہ ایک خوش حال گھرانے کی بیٹی تھی۔ اُس کے والد کا شمار شہر کے کامیاب کاروباری لوگوں میں ہوتا تھا۔ گھر میں والدین نے اُسے بہت لاڈ پیار سے پالا ہوا تھا۔ بہن بھائی بھی بہت محبت کرتے تھے۔ وہ خود بھی ہنس مکھ ملنسار اور جولی طبیعت کی تھی اس لیے وہ اپنی یونیورسٹی فیلوز اور سہیلیوں میں کافی مقبول تھی۔ سائرہ کی زندگی میں کوئی غم کوئی روگ نہیں تھا نہ محبت کا اور نہ کوئی اور۔ اُس کی اپنے کزن کے ساتھ منگنی ہو چکی تھی اور اگلے برس شادی ہونے والی تھی اور دونوں میں خوب انڈر سٹینڈنگ تھی۔ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی۔ کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی دونوں شدید محبت کے مرض میں مبتلا تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا تو پھر اچانک سائرہ کا زہریلی ادویات کھا کر خودکشی کر لینا بالکل سمجھ سے باہر تھا اور یہ معاملہ پولیس خود اُس کے گھر والوں سمیت تمام لوگوں کے لیے ایک معمہ بن گیا تھا۔ مگر یہ معمہ اس وقت حل ہو گیا جب اُس کے یونیورسٹی فیلو توقیر کی خودکشی کی خبر ملی۔ اُس کی نعش کے پہلو سے یہ تحریر ملی:

''سائرہ!

تم نے خودکشی نہیں کی میں تمہارا قاتل ہوں۔ میں نے تمہیں اپنی محبت کے جال میں پھنسانے کی کوشش کی مگر تم ایک شریف لڑکی تھیں۔ تم نے نہ صرف مجھے پہلے پیار سے سمجھایا کہ تم انگیج ہو مگر جب میں پھر بھی نہیں مانا تو تم نے میرے ساتھ سخت رویہ اپنایا۔

اُس دن جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ کینٹین پر بیٹھا تھا تو تمہیں اچانک دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں بغیر سوچے سمجھے تمہاری جانب کھنچا چلا آیا ان۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا اور زبردستی اپنی ٹیبل پر لے آیا۔ تم نے شدید غصہ میں ہاتھ چھڑایا اور مجھے گالی دی۔ میں نے زندگی میں کبھی گالی نہیں سنی تھی اور وہ بھی ''بے غیرت'' کی۔ سو میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ کیونکہ میرے دوستوں کے سامنے میری شدید بے عزتی ہوئی تھی اس لیے میں نے تمہیں ''کشتی'' کہہ دیا۔ اُس وقت تمہاری حالت دیکھنے والی تھی۔ تمہارے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ میرے علم میں بالکل یہ بات نہیں تھی کہ تم اتنی حساس ہو کہ صرف اس بات پر اپنی جان دے دو گی۔ میں تم سے سچی اور شدید محبت کرتا تھا مگر محبت جتانے کو میرا انداز غلط تھا۔ تمہاری خودکشی کی خبر سن کر میں ڈر گیا اور اپنے تمام دوستوں کو اس معاملے سے متعلق بات کرنے سے روک دیا۔ مگر مجھے اندر سے ایک پل بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ میں خود کو تمہارا قاتل سمجھ رہا تھا اور اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی تمہاری موت کے بعد میری زندگی کا جواز نہیں تھا۔ میں اپنی جان اس لیے دے رہا ہوں کہ اس طرح شاید تمہاری روح کو کچھ سکون ملے۔ ورنہ میرا جرم اتنا بڑا ہے کہ میری روح کو تو شاید مر کر بھی چین نہ ملے۔

یادیں

عثمان لگ بھگ بیس برس بعد امریکہ سے پاکستان اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ ان بیس برسو میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جس دن اُس نے اپنے گاؤں کو یاد نہ کیا ہو۔ کیکر کے تنے سے لگ کر جب اس نے پہلی بار امریکہ جانے کا سپنا دیکھا تھا تو اُسے یہ ایک انتہائی خوب صورت اور سفاک خواب کی طرح لگا۔ خوب صورت اس لیے کہ اس نے دنیا کی واحد سپر پاور اور بڑے ترقی یافتہ ملک کا سپنا دیکھا تھا۔ سفاک اس لیے کہ اس کی تعبیر کے اثرات دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ سفر تو ہاتھ کی لکیروں میں لکھا ہوتا ہے۔ دو سال کی لگاتار کوشش اور منصوبہ بندی کے بعد بالآخر عثمان کا ویزہ لگ گیا اور وہ امریکہ چلا گیا۔ جن دنوں وہ گاؤں میں امریکہ کے خواب دیکھتا تھا اُسے اپنے گاؤں کی ہر چیز بری لگنے لگی تھی اور وہ رات دن گاؤں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ مگر امریکہ آ کر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا گاؤں کی محبت اُس کے اندر جاگزیں ہوتی گئی۔ اُسے اپنے ماں باپ، گھر، کھیت، درخت، کنواں اور سیدھے سادے لوگ دوست بہت یاد آنے لگے۔ اُس کا خیال تھا کہ امریکہ کی چکا چوند میں یہ گاؤں یاد آنے والا غبار جلدی اُتر جائے گا۔ مگر اس کا ٹمپریچر بڑھتا ہی گیا۔ امی اور ابو کا انتقال ہوا۔ مگر عثمان پاکستان نہ آ سکا۔ یہ ملال کہ وہ اپنے والدین کا آخری وقت پر چہرہ بھی نہ دیکھ پایا ایک کسک بن گیا اور اُسے پہلی بار پردیس اور امریکہ سے نفرت ہو گئی اور اُس نے سوچ لیا کہ کچھ عرصہ مزید رقم کمانے کے بعد وہ

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان چلا جائے گا تا کہ وہاں جا کر کوئی بزنس کر سکے اور اب وہ لمحہ آ گیا تھا۔عثمان اپنی آنکھوں میں جو گاؤں کے منظر بھر کر لے گیا تھا گاؤں پہنچتے ہی اُس کی آنکھیں انہی مناظر کی متلاشی تھی۔مگر جیسے ہی وہ گاؤں پہنچا اُسے دھچکا لگا۔ کیونکہ اُس کی حالت یکسر بدل چکی تھی اور پرانے منظروں میں سے کوئی منظر اُسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے گاؤں کے لاری اڈے پر اُس کا دوست ظفری قلفی کی ریڑھی لگا تا تھا اور وہ قلفی اتنی مشہور تھی کہ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جتنی بسیں وہاں سے گزرتیں تقریباً تمام مسافر ہی وہ قلفی کھاتے تھے۔عثمان نے بس سے اُترتے ہی سب سے پہلے ظفری اور اُس کی قلفی والی ریڑھی ڈھونڈی مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ ہر طرف بڑی خوبصورت دکانیں بن گئی تھیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اب تو ظفری ایک بہت بڑے ریسٹورنٹ کا مالک بن گیا جہاں کھانے پینے کی تمام چیزیں میسر ہیں۔قلفی صرف اُس کا جزو ہے بجلی کے آنے سے جدید برقی ساز و سامان کی اب یہاں بھی بہتات تھی۔اچھا خاصا چھوٹا سا شہر بن چکا تھا اور اردگرد کے دیہات کے بہت سے لوگ یہاں شاپنگ کے لیے آئے ہوئے نظر آتے۔اُسے کنواں اور کھیت کہیں نظر نہ آئے۔ بلکہ ہر طرف عالی شان کوٹھیاں اور پختہ سڑکیں نظر آئیں۔ظاہر ہے اس کی طرح باقی گاؤں والے بھی باہر کے ملکوں میں چلے گئے جو پڑھے لکھے تھے وہ یورپ کی طرف نکل گئے جو مزدور پیشہ تھے وہ سعودیہ اور خلیج کے دیگر ملکوں میں بسلسلہ روزگار چلے گئے۔لہٰذا جب ڈالر، یورو، ریال اور درہم آنے لگے تو گاؤں کا نقشہ دیکھتے ہی دیکھتے بدل گیا۔اب وہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر بن چکا تھا لیکن عثمان جس گاؤں کا نقشہ دیکھنا چاہتا تھا وہ مفقود تھا۔وہ بہت دلبرداشتہ ہوا اور اُس نے چند دن رہنے کے بعد ہی فیصلہ کر لیا کہ اسے واپس چلے جانا چاہیے۔مگر جانے سے پہلے وہ کوئی نہ کوئی نشانی اپنے بچپن کی گاؤں میں سلامت دیکھنے کا

خواہش مند تھا۔ ایک دن وہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر بہتی ندی پر چلا گیا۔ وہاں جا کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ ندی کنارے وہ بیریاں اب بھی سلامت تھیں۔ بچپن میں وہ دوستوں کے ساتھ ان پر چڑھ کے بیر کھایا کرتا تھا۔ اُن کے نیچے بیٹھ کر اسے یوں لگا جیسے اُس کا بچپن اور دوست لوٹ آئے ہوں۔

قسمت

آج عید کا دن تھا۔شہر میں رات سے ہی سڑکوں کی صفائی کر دی گئی تھی۔صبح سے ہی ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔گلیوں میں غبارے بیچنے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔تنویر نے ایک نظر گھر کی کھڑکی سے جھانکا تو گلی میں رنگ برنگے غبارے اُسے نظر آئے اور بچوں کے لیے کھلونے بیچنے والے اور کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے دکھائی دیے۔ تنویر نے سوچا آج اسے جتنا جیب خرچ ملے گا وہ جی بھر کے اپنی پسند کی چیزیں خریدے گا اور جو اس کا جی چاہے گا وہ کھائے گا۔ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اُس کی امی کی آواز آئی۔تنویر بیٹا جلدی سے تیار ہو جاؤ پاپا کے ساتھ عید نماز پڑھنے جانا ہے تم نے دیر ہو رہی ہے۔ یہ آواز سنتے ہی تنویر جھٹ سے بستر سے اُٹھا اور واش روم نہانے کے لیے چلا گیا۔ نئے کپڑے اور شوز پہن کر اُسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔اُسے نئے کپڑے اور نئے شوز پہننا بہت پسند تھا۔آج بھی اس کی خوشی دیدنی تھی۔اُس نے اپنے پاپا کے ساتھ قریبی جامع مسجد میں عید کی نماز پڑھی۔اتنے لوگوں کی موجودگی میں اسے نماز پڑھنا بہت اچھا لگا۔عید نماز کے بعد وہ اپنے دوستوں سے عید ملا جو بھی جاننے والا ملتا اُسے نئے نوٹوں کی عیدی ضرور ملتی۔گھر کے ہر فرد سے بھی اسے اچھی عیدی مل چکی تھی۔لہٰذا اس نے گلیوں میں گھوم پھر کے اپنی پسند کے غبارے اور کھلونے خریدے اور جب بھی بھوک لگی اپنی پسند کا آرڈر دے کر برگر، شوارما اور چپس وغیرہ کھا کے اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیلا۔گھر میں کھانے کے لیے میٹھے میں بہت سی چیزیں الگ سے تھیں۔گھر میں جتنے

رشتہ دار ملنے آئے چچا چچی، ماموں ممانی انھوں نے اُسے خوب پیار کیا۔تنویر تھا ہی بڑا کیوٹ اور شارپ۔ پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔اس لیے سب ہی اسے بہت پیار کرتے تھے۔اب تنویر نے عید کا باقی دن خوب موج مستی میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا کہ اتنے میں اس کے کانوں میں نہایت تلخ الفاظ گونجے جس کے ساتھ دو تین بڑی کمینی گالیں بھی تھیں۔ یہ آواز اُس کے ہوٹل کے مالک کی تھی جو غصے میں کہہ رہا تھا۔

''تنویر جلدی جلدی برتن دھو۔ تجھے پتہ نہیں آج عید کا دن ہے اور سارا دن گاہکوں کا رش رہنا ہے اور ابھی تو نے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں باقی لڑکے چھٹی پر ہیں۔''

تنویر کے سپنوں کا تاج محل دھڑام سے زمین پر آ گرا اور وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے جلدی جلدی برتن دھونے لگا اور اُس کی آنکھیں بھگتی چلی گئیں۔

ہاں

آ صفہ کی زندگی کی ساری کامیابیاں ایک ''ہاں'' کی دوری پر تھیں۔مگر اس نے ہمیشہ اس ہاں کو ناں میں بدلا۔مگر اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔وہ تعلیم مکمل کر چکی تھی۔اُس نے ہمیشہ اعلیٰ گریڈ میں تمام امتحانات پاس کیے تھے۔خوب صورت اور بلا کی ذہین تھی۔Self Confidence بھی بلا کا تھا۔اس لیے وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔اگرچہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی مگر زندگی میں اس نے کسی خواہش کو اپنی مجبوری نہیں بنایا تھا۔اُسے بہت اچھی اچھی جابز پرائیویٹ سیکٹر میں آفرز ہوئی تھیں۔مگر ہر جگہ جاب کی پہلی شرط ایسی رکھی جاتی جس سے اُس کی عزت پر حرف آتا تھا۔اس لیے اس نے کبھی ''ہاں'' نہیں کی اور انکار کرنے کی سزا تو پھر ملتی ہے۔آصفہ نے کسی کمزوری کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا۔سرکاری جاب بھی بہت اچھی مل جاتی۔مگر ہر بار انٹرویو میں کوئی نہ کوئی بااختیار شخص ایسا ضرور ہوتا جو اس کے منہ سے ''ہاں'' سننا چاہتا اور آصفہ ناں کہہ دیتی۔نتیجہ وہی نکلتا جو پہلے سے معلوم ہوتا۔اس نے زندگی میں کبھی پچھتاوا محسوس نہیں کیا۔اُس نے بے شمار جگہ انٹرویوز دیے۔کئی جگہ جاب ملی بھی مگر ماحول صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اس نے چھوڑ دی۔وہ انتہائی شریف اور باصلاحیت لڑکی تھی۔اُس میں ایک اچھا اینکر بننے کی تمام خوبیاں تھیں۔مگر ہر چینل پر مشکل یہ درپیش آتی کہ وہ اس سے ''ہاں'' سننا چاہتے تھے جو کہ ناممکن تھی۔اس ساری صورت حال سے تنگ آ کر اس نے گھر پر ہی لڑکیوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی لڑکیاں ہو گئیں۔

اُس کی اچھی خاصی انکم ہو گئی۔ اس کے رشتے آنے لگے تو اس کے والدین نے ایک مناسب رشتہ دیکھ کے اس کا بیاہ کر دیا۔ شادی کے دوسرے دن ہی اسے میکے بھیج دیا گیا۔ قصور وہ تھا جسے آصفہ خود بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے شوہر نے یہ الزام لگا کر اسے طلاق دے دی کہ وہ کنواری نہیں تھی۔ اس طرح آصفہ کو جس کرب سے گزرنا پڑا وہ نا قابل بیان تھا۔ چونکہ وہ بلا کی خود اعتماد تھی اتنے بڑے صدمے کو سہہ گئی۔ بوڑھے والدین بیمار رہنے لگے تو ان کی بیماریاں ایسے مراحل میں داخل ہو گئیں کہ جن کے علاج کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی۔ آصفہ کو ایک بہت اچھی جاب آفر ہوئی۔ Pay اتنی پر کشش تھی کہ وہ اپنے والدین کا علاج با آسانی کر سکتی تھی۔ مگر مرحلہ وہی درپیش تھا کہ ''ہاں'' اور اس نے ''ہاں'' کر دی۔ جب ملتے ہی بہت سے رشتے آنے لگے اور اس نے اس بار اپنی مرضی کے آدمی سے شادی کی حامی بھر لی۔ صرف ایک ہاں سے اس پر اب تو نہ کوئی بدنامی کا داغ تھا نہ طلاق یافتہ ہونے کا کیونکہ اس کے پاس اب پیسہ بھی تھا اور اچھی جاب بھی۔

افیئر

طاہرہ آج صبح مسلسل رورہی تھی۔ روروکر اُس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ اُسے اشرف کی باتوں سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ جھگڑے تو پہلے بھی کئی بار ہوئے تھے مگر اس بار تو اشرف نے اس کی ذات اور عزت پر گھناؤنے الزام لگائے تھے جن سے وہ مکمل طور پر ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ابھی خودکشی کرلے۔ ابھی تو اس نے صرف محبت میں چند دن ہنستے کھیلتے گزارے تھے۔ ان دنوں میں کچھ تلخیاں بھی تھیں لیکن خوشیاں بہت زیادہ تھیں۔ مگر ابھی شادی اور گھر بسانے کے اس نے کیا کیا سپنے دیکھے تھے۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اشرف ایسی لنگویج بھی استعمال کرسکتا ہے۔ اُس کا اشرف تو کبھی ایسا نہیں تھا۔ اسے پہلا دن یاد آرہا تھا جب وہ اشرف سے ملی تھی۔ کتنی چاہت اور محبت تھی اشرف کی آنکھوں میں۔ کتنا نرم مزاج تھا وہ۔ کبھی اس کے بعد بھی اسے اونچی آواز میں اس نے بات کرتے نہیں سنا۔ رفتہ رفتہ محبت بڑھتی گئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ سارا دن اور رات دیر تک وہ شہر کی سڑکوں پر گھومتے مختلف ریسٹورنٹ میں کھانے کھاتے فلمیں دیکھتے شاپنگ کرتے اور بہت سی محبت بھری باتیں شاید اتنی زیادہ قربت کی وجہ سے اشرف کا دل اب اُس سے بھر گیا تھا اور وہ اب چھوٹی چھوٹی بات پر اس سے لڑنے لگا تھا۔ ذراسی بات پر وہ اتنا ہائپر ہوجاتا کہ وہ کانپ جاتی اور آج تو اس نے ایسی ایسی باتیں کی تھیں کہ اُس کے بعد اشرف کے ساتھ ایک دم بھی چلنا اس کے لیے محال تھا۔ تقریباً ایسی ہی صورت حال سے اشرف گزررہا تھا۔ اُسے زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ وہ

Handsome تھا، پرکشش تھا، بہت سی لڑکیاں اس کی طرف راغب ہوتی تھیں۔ مگر اُس نے سوچا ہوا تھا جس لڑکی سے اُسے محبت ہوگی اُسی سے وہ شادی بھی کرے گا۔ منزہ اُسے پہلی ہی ملاقات میں پسند آ گئی اور وہ اُسے دل دے بیٹھا۔ منزہ کو بھی اشرف بہت اچھا لگا۔ منزہ کے ساتھ محبت میں اُس کے انتہائی یادگار شب و روز بسر ہونے لگے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منزہ کی ایک ایسی عادت سامنے آئی جس سے وہ اُس کی قربت میں گھٹن محسوس کرنے لگا اور وہ یہ تھی کہ منزہ اس پر بلاوجہ شک بہت کرتی تھی۔ اشرف کی گیس کمپنی تھی اور آفس میں کئی لڑکیاں جاب کرتی تھیں۔ منزہ جیسے جیسے سب کو جانتی گئی اُس نے اشرف کے ساتھ اُس کا افیئر ڈکلیئر کر دیا اور اُس سے غصہ میں پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیتی۔ کیا کیا الزام لگاتی جس سے اشرف کا دماغ پھٹنے لگتا اور اب وہ ایسے جھگڑوں سے تھک گیا تھا۔ اس کا مزاج نہیں تھا لڑنے جھگڑنے والا۔ آج جب اسے آفس سے ایک لڑکی کی کال آئی اُسے چھٹی چاہئے تھی جو کہ اشرف نے دے دی۔ اس پر پھر منزہ نے اُسے کہا کہ تمہارا اس سے ضرور افیئر ہوگا جو فوراً چھٹی دے دی۔ اشرف تو پہلے ہی تنگ تھا۔ اُس نے بھی منزہ کے فون میں جن میلز کے نمبر تھے سب سے اس کا افیئر ڈکلیئر کر دیا اس طرح دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔

سمت

مظہر سلیم فطری طور پر اپنے اندر ایک بے چین روح لے کر پیدا ہوا تھا۔ بچپن سے ہی اُسے سیاحت کا بے انتہا شوق تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی سائیکل پر دور تک پھیلے میدانی راستوں میں نکل جاتا۔ اُسے ان دیکھی جگہیں اور ان دیکھے راستے بہت پرکشش لگتے تھے۔ دور سے نظر آنے والے مناظر اسے اپنی جانب بلاتے تھے۔ وہ بڑا ہوا تو اُس کے والد کا ٹرانسفر جنت نظیر وادی ہنزہ میں ہو گیا۔ ان علاقوں میں اس کے شوق سیاحت کو اور بھی مہمیز ملی۔ پہاڑ، وادیاں، جھیلیں اور جھرنے دیکھنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں تھا۔ وہ مختلف رنگوں کے پودے اور پھل دیکھ کر اپنے رب کی کاریگری پر بہت حیران ہوتا۔ برسرِ روزگار ہوا تو سیونگ کر کے چند سالوں میں پورا پاکستان گھوم لیا۔ پھر باہر کے ممالک کی سیاحت نے اس کی راتوں کی نیندیں اُڑا دیں اور اس نے ہر سال ایک ملک کی سیر کا پروگرام بنایا۔ اس طرح اُس نے کئی ممالک کی خوب سیر کی۔ ابتدا میں گھر میں مذہبی ماحول ہونے کے باعث وہ بھی انتہا پسند تھا۔ یعنی اپنے فرقے سے متعلق وہ کوئی بات نہیں سنتا تھا۔ دوسرے فرقے کے لوگوں کو کافر سمجھتا تھا۔ اس طرح ذرا سی بات پر مارنے اور مرنے پر تل جاتا لیکن صرف شوقِ سیاحت نے رفتہ رفتہ اس کے تنگ ذہن میں کشادگی بھر دی۔ اس نے جب دیکھا کہ سورج جب صبح طلوع ہوتا ہے تو اس کی نرم نرم کرنیں بلا تفریق اپنی نرماہٹ سب چہروں پہ بکھیرتی ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس چہرے کا تعلق کس فرقے سے ہے۔ اسی طرح بادل جب رم جھم کرتے ہیں اور بارش برساتے ہیں تو

وہ بھی مسجد، مندر اور گرجے کے فرق کو بھول جاتے ہیں۔ قدرت کی رحمت زمین پر رہنے والی تمام مخلوق پر یکساں برستی ہے۔ اُس نے جب مختلف ممالک کی تہذیب وثقافت کو قریب سے دیکھا تو اُسے بہت حیرانی ہوئی کہ قدرت نے کہاں کہاں اور کیسے اپنی خوب صورتیاں بکھیری ہوئی ہیں۔ اُسے اب یوں لگتا تھا جیسے وہ کنویں سے نکل کر پہلے دریا اور اب سمندر میں آ گیا ہے۔ کائنات کے مخفی راز اُس پر عیاں ہونے لگے تھے۔ جبکہ اس کے برعکس اس کے دیگر بھائی اعلیٰ تعلیم کے باوجود ابھی محدود سوچ کے حامل تھے۔ اب جب وہ ان سے گفتگو کرتے تو اُسے اپنے بھائیوں کی حالت پر ترس آتا اور اس پر قرآن کی یہ آیت کہ فیسروفی الارض سمجھ میں آ گئی اور وہ اس بات کا قائل ہو گیا کہ صحیح اور درست سوچ کے لیے محدود سرکل سے نکل کر وسیع سرکل میں داخل ہونا انتہائی ضروری ہے۔

حاجی نمبر دار

اس نے حج تو کبھی نہیں کیا تھا لیکن اس کا نام پھر بھی حاجی نمبر دار تھا جو کہ اپنی دو نمبریوں کی وجہ سے پورے گاؤں میں مشہور تھا۔حاجی نمبر دار کے پاس اچھی خاصی زمین اور ڈنگر تھے اور خدا کا دیا ہوا سب کچھ اس کے پاس تھا نہ تھا تو شکر اور صبر۔

حاجی نمبر دار سود کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ وہ چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کو جہاں زمین سود کے ساتھ ٹھیکے پر دیتا تھا وہیں کھاد اور اسپرے وغیرہ بھی سود پر دیتا تھا۔ علاقے کے تمام چھوٹے بڑوں کو پتا تھا کہ حاجی نمبر دار کے پاس بہت پیسہ ہے اور ایسے اس کی خبر چند چور ڈکیتوں کو بھی تھی۔ حاجی نمبر دار کنجوس ہونے کے ساتھ ساتھ کافی ڈرپوک بھی تھا اور اسے رات کی نیند بھی مشکل سے آتی تھی کہ کہیں کچھ مال چوری نہ ہو جائے۔

ہر طرح کی تسلی کرنے کے باوجود بھی اس کے گھر سے چوری ہوگئی اور چور کافی سونا اور نقدی لوٹ کے جانے میں کامیاب ہو گئے۔نمبر دار نے کھوجی بھی بلایا مگر کچھ خاص کامیابی نہ ہوئی اور چوروں کا سراغ نہ مل سکا۔وقت گزرتا گیا اور کپاس کی چنائی کے دن آ گئے تھے۔ یہ وہ دن ہوتے ہیں کہ کسانوں کے ہاں خوشحالی ڈھول بجاتے ہوئے آتی ہے اور وہیں حاجی نمبر دار کی وصولی کے دن بھی آ جاتے ہیں اور وہ کھاتہ کاپی اُٹھائے وصولی کو نکل پڑتا ہے۔ بے شک کسان بہت محنت کرتے ہیں۔زمین کو زرخیز بنانے اور اس پر ہر طرح کی کاشت اور پانی بروقت دینا وہ ان سب چیزوں کا بہت خیال کرتے

ہیں۔مگر ایک کام جو اللہ کو سخت ناپسند ہے کہ سود لینے اور دینے والا دونوں دوزخی ہیں۔ سود کے کاروبار میں وقتی لذت ضرور ہوتی ہوگی۔مگر برکت کبھی نہیں ہوسکتی۔تمام کسانوں کا برا حال تھا اور کپاس کی فی ایکڑ اوسط اتنی کم تھی کہ خرچے بھی بڑی مشکل سے پورے ہوتے۔مگر حاجی نمبردار کو اس سے کیا غرض یوں اس نے پرانی رقم بمع سود وصول کر لینی تھی وہیں مزید آگے سود دے سکتا تھا۔کیوں کہ ان لوگوں کے پاس اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔مگر یہی ان کی غلط فہمی تھی رزق کا وسیلہ کرنے والی اللہ کی ذات ہے۔خیر حاجی نمبردار نے جب تمام وصولی کر لی تو اسے اب ڈر تھا کہ وہ اتنا مال کہاں محفوظ رکھ سکتا ہے۔چاہے جتنا بھی رات کو جاگ لے اسے وہم تھا کہ آنکھ لگی تو چوری ہو جائے گی۔ وہیں اس کی بیوی نے اسے مشورہ دیا کہ ہم یوں کرتے ہیں یہ جو ہمارا تندور ہے اس میں رات کو چھپا کے رکھ دیا کریں گے اور صبح صبح تم نکال لیا کرنا۔دن میں کسی کی اتنی مجال کہ ڈاکہ ڈالے۔

مگر حاجی نمبردار رسک نہیں لینا چاہتا تھا تو اس کی بیوی نے ایک ترغیب سوچی۔ہم زیادہ مال تندور میں اور تھوڑا جیسے تم اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتے ہو وہاں رکھو کچھ مال اندر رکھتے ہیں۔دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔کون سا مال چوری ہوتا ہے۔چور بھی چوری کے انتظار میں تھے۔تمام کالی رات چاند کے ساتھ ساتھ ستارے بھی لگتا غائب تھے اور چور چوری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔صبح حاجی نمبردار نے دیکھا تو اس کے تکیے اور اندر صندوق میں رکھا مال غائب تھا تو وہ فوراً تندور کی طرف بھاگا اور تندور میں دیکھتے ہی اُس کی جان میں جان آ گئی کہ تندور والا مال محفوظ تھا اور اس نے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے اپنی بیوی کو دیکھا اور یوں اس کا معمول بن گیا وہ جتنا مال ہوتا رات کو تندور میں رکھ دیتا اور صبح نکال لیتا۔دن گزرتے گئے۔ایک دن صبح اُٹھتے ہی اسے بہت

بھوک لگی تھی۔اس نے غصے سے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے روٹی بنا دے اور اس نے جلدی میں آٹا گوندھا اور بے دھیان میں لکڑیاں ڈال کے آگ لگا دی جب حاجی نمبردار روٹی کھانے لگا تو اچانک اس کی نظر تندور سے نکلتے دھواں پر پڑی اور اس کے منہ سے ''مال'' ہی نکل سکا اور ہارٹ اٹیک سے اس کی موت ہو گئی۔

رشک

ہم زندگی میں خوشیوں، خوابوں، حسرتوں کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہتے ہیں کہ خواب سچ ہو جائیں کہ کوئی خواہش حسرت نہ رہ جائے لیکن موجودہ دور میں اتنے وسائل ہمارے پاس نہیں ہوتے کہ ہم اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں۔ یہاں اگر برانڈ کے کپڑے اور دیگر اشیاء استعمال کرنے والا طبقہ موجود ہے تو یہاں لنڈے کے کپڑے اور دیگر سستی اشیا خریدنے والا غریب طبقہ بھی موجود ہے۔ اس غریب طبقے کو اگر شیشے والی بڑی دکانوں کے باہر کوئی سستی سیل سکیم نظر آ جائے تو یہ لوگ بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں خریدتے ہوئے کہ انسان کی کچھ فطرت اس کے وسائل اور ضروریات کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ آج روزے کی حالت میں دل دہلا دینے والی ایسی خبر سنی کہ اس کو بیان کرنے کے لیے لفظ درد بن جاتے ہیں۔ میں آگ کی اس تپش کو محسوس کر رہی تھی جو کچن میں کھانا بناتے ہوئے اکثر محسوس ہوتی ہے۔ دل کانپ گیا جن کا پورا وجود ایک پل سے بھی پہلے راکھ بن گیا۔ مسکراتے چہرے پل میں بت بن چکے تھے۔

''سانحہ احمد پور شرقیہ'' ضائع شدہ تیل لوٹتے لوٹتے وقت نے کئی زندگیاں لوٹ لیں۔ ہر طرف دکھ کے ساتھ ساتھ کچھ تنقیدی تبصرے بھی ہونے لگے کہ لالچ ہوس نے ان لوگوں کو نگل لیا۔ میں تب سوچنے لگی کہ سو روپے کے تیل لوٹنے والوں کو خدا نے اتنی جلدی نشان عبرت بنا دیا۔ مگر کھربوں لوٹنے والوں کا انجام کیا ہوگا۔ شاید اس جہاں میں ہوگا بھی یا نہیں؟

اس واقعہ میں بے شک پوری بستی ویران ہوگئی تھی۔ کچے مکانوں میں بڑے پکے درد چلا رہے تھے۔ یہاں بے زبان جانورتک رنجیدہ تھے۔ جہاں کئی گھر اُجڑ گئے وہاں ماسی بختو کا گھر بھی قبرستان بن گیا تھا۔اس کے تین نوجوان بیٹے ایک بہواوراس کا شوہر اس واقع میں جاں بحق ہو گئے تھے۔اس کے ساتھ توغم بانٹنے کے لیےکوئی نہ تھا۔ ماسی بختو بے چاری اکیلی تھی اوردوآنکھیں اپنے ان پیاروں کے لیےکتنا روئیں کہ اشک کم پڑ گئے۔کئی بے ہوشی کے دوروں کے بعد ہوش میں آتی تو وہ بھی ایک بت سی لگتی۔اب اس کا اس جہاں میں کوئی دوسرا آسرانہیں تھا۔تھوڑا وقت گزرااورحکومت پنجاب کی جانب سے امداد کا اعلان ہوا۔

اور وزیراعلیٰ پنجاب اس بدقسمت بستی میں تشریف لائے اور امدادی چیک تقسیم کرنے لگے۔نمبردار بھی ماسی بختو کوکسی طرح وہاں لے آیا اور وزیراعلیٰ صاحب نے ایک کروڑ کا چیک ماسی بختو کو دیتے ہوئے قیمتی جانوں کا اظہار افسوس کیا اور وہ ناسمجھی آنکھوں سے مجمعے کو دیکھ رہی تھی اورلوگ اس کی قسمت پر رشک کرر ہے تھے۔ ماسی بختو کروڑ پتی بن گئی۔

ننھا دہشت گرد

کامل پیدائشی معذور تھا۔ اُس کے دماغ کے علاوہ جسم کے تمام اعضا بیکار تھے۔ ماں پیدائش کے چند سال بعد اپنے بیٹے کی دائمی معذوری کا دکھ سینے سے لگائے چل بسی۔ باپ نے اس خوف سے شادی نہیں کی کہ سوتیلی ماں آ کر بے جا سلوک روا رکھے گی اور کہیں معصوم کو ظلم وستم کا نشانہ ہی نہ بنا لے۔ کیونکہ اس نے تو سارا دن گھر نہیں رہنا تھا۔ کامل نہ تو بیٹھ سکتا تھا نہ کچھ اپنے ہاتھوں سے کھا سکتا تھا اور نہ ہی چل سکتا تھا۔ تمام تر معذوری کے علاوہ اس کا چہرہ انتہائی خوب صورت تھا۔ گوری رنگت تیکھے نقش نین بڑی بڑی آنکھیں اور بلا کی معصومیت اور صحت مند دماغ کامل ہر بات سمجھتا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ صرف چہرے کے تاثرات سے اظہار کرنے کی کوششیں کرتا۔ سب رشتے دار بہن بھائی اس کے باپ کے دوسرے شہروں میں رہتے تھے اور اگر قریب بھی ہوتے تو کامل کی دیکھ بھال پھر بھی کسی نے نہیں کرنا تھی کیونکہ سب کی اپنی اپنی زندگی اور اپنے اپنے مسائل ہیں۔ کسی کے مسئلے کو اپنا مسئلہ کون بناتا ہے۔ جب کبھی وہ ملنے کے لیے گھر میں آتے تو وہ رسمی طور پر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کے ذرا سی دیر بات کرتے۔ اس میں بھی بہت مصنوعی پن ہوتا۔ کامل کو پتہ چل جاتا کہ کون اس سے فاصلہ رکھتا ہے کون اسے سچے دل سے پیار کرتا ہے اور کون دکھاوا کرتا ہے۔ خالق نے اس کی ساری توانائیاں اس کے دماغ اور چھٹی حس میں رکھ دی تھیں۔ اس لیے وہ ہر قریب آنے والے کو اس کی نیت کے مطابق Response کرتا تھا جس سے ایک بار تو مکاری کرنے والا بھی جھینپ جاتا

تھا۔ کیونکہ وہ کامل کو معذور اور لاچار سمجھ کے یہ سب کر رہا ہوتا تھا۔ کامل کے باپ کو ہی صرف روز و شب اس کی فکر لاحق تھی۔ خاص کر ورکشاپ جاتے ہوئے وہ اُسے تیار کر کے چار پائی پر کھڑکی کے پاس لٹا کر جاتا تو کام کے دوران اس کا مکمل دھیان کامل کی طرف رہتا۔ ہر وقت یہی خوف دامن گیر رہتا کہ کہیں اس کی طبیعت اچانک خراب نہ ہو جائے۔ کہیں کوئی زہریلی مکھی اسے کاٹ نہ لے۔ محدود وسائل کے باوجود کئی بار اس نے نوکرانی رکھی جو اس کی دیکھ بھال کرے۔ مگر اُس کی عدم موجودگی میں کوئی بھی اس کا خیال نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ اُلٹا اس کو نقصان پہنچایا جاتا۔ ایک تو کامل اپنے چہرے کے تاثرات سے بتا دیتا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کو اس کے باپ سے زیادہ اب کون سمجھ سکتا تھا۔ کیونکہ اب وہ صرف باپ نہیں ماں بن کر بھی اسے پال رہا تھا۔ اس کی گاڑیوں کی ورکشاپ تھی۔ بڑے امیر اور صاحب حیثیت لوگ اُس کے واقف تھے۔ وہ اس کی مالی مدد کرنا چاہتے تھے مگر اس کی انا کو یہ گوارا نہ تھا۔ اُس نے پتہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جس میں اتنی جدید سہولیات میسر ہوں کہ اس کا علاج ہو سکے یا اُسے مکمل طور پر رکھا جا سکے۔ اس کی دیکھ بھال کی جا سکے۔ بالآخر کسی جاننے والے نے جو کہ کینیڈا میں رہتا تھا اسے مشورہ دیا کہ اگر تم کسی طرح اس کو لے کر کینیڈا آ جاؤ تو وہاں اس کا علاج ممکن ہے۔ اس نے ایک ایجنٹ سے بات کر کے ویزہ کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ کینیڈا کے دوست نے اُسے وہاں سے اسپانسر بھی منگوا دیا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا آج کل دہشت گردی کی وجہ سے ویزے بڑی مشکل سے لگتے ہیں۔ کامل کے باپ نے کہا میرا بیٹا تو معذور ہے اُس کا دہشت گردی سے کیا تعلق۔ کئی ماہ کی انتھک محنت کے بعد ویزے اپلائی کر دیے گئے۔ مگر چند ماہ بعد Refused کا لیٹر آ گیا تو کامل کے باپ کو انتہائی مایوسی ہوئی اور اس نے اس دن سے کامل کا نام ننھا دہشت گرد رکھ دیا۔

قابلِ عزت

فرید ایک متوسط طبقے کا فرد تھا۔ اُس نے ساری زندگی نہایت ایمانداری سے بسر کی جس قدر ممکن تھا اسلامی تعلیمات پر عمل کیا۔ وہ زندگی کے تمام معاملات میں میانہ روی اختیار کرتا۔ اس لیے مذہبی معاملات میں بھی متشدد نہیں تھا۔ اپنے ملک کے بارے میں وہ اوائل عمر سے فکر مند رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے سیاسی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کاروبار شروع کیا تو ہمیشہ اس پارٹی کی سپورٹ کی جو ملک کے ساتھ وفاداری کی دعویدار ہوتی اور عالمی سطح پر ملک کو باوقار بنانے کا نعرہ لگاتی۔ مگر بدقسمتی سے گزشتہ ۴۰ برس میں نہ تو کوئی سیاسی جماعت اور نہ ہی کوئی ڈکٹیٹر اُس کی امیدوں پر پورا اُترا۔ سب نے اپنے مفادات کو پیش نظر رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک مقروض ہوتا چلا گیا۔ عوام بدحال ہوتے چلے گئے۔ فرید کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ کرپشن کا ناسور تھا۔ اس لیے وہ کرپٹ حکمرانوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ جب کسی ڈکٹیٹر نے یہ نعرہ لگا کر ملک کے اقتدار پر قبضہ کیا کہ وہ کرپشن کا خاتمہ کرے گا لوٹی ہوئی دولت جو بیرون ملک پڑی ہے واپس لائے گا اور کرپٹ سیاستدانوں کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرے گا تو فرید نے مارشل لا کے خلاف ہونے کے باوجود اس کا ساتھ دیا مگر کوئی بھی ڈکٹیٹر یہ نہ کر سکا۔ مایوسی کی اس فضا میں ایک نئی جماعت نے نئے لیڈر نے جب کرپشن کے خلاف اپنا علم بلند کیا تو فرید ایک بار پھر اس کی صف اوّل میں شامل ہو گیا اور ایک بار مکمل تن من دھن سے کرپشن کے خاتمہ کے لیے سرگرداں ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ بالآخر کرپشن کے خلاف تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ کرپٹ سیاستدانوں کے خلاف

مقدمات عدالت میں شروع ہو گئے اور ملک کی تاریخ میں پہلی بار صحیح معنوں میں احتساب کا عمل شروع ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے منتخب وزیراعظم کو کرپشن کے جرم میں نااہل ہونا پڑا۔ اُس کے پارٹی کے کافی وزیر بھی نااہل ہو گئے۔ اسی طرح دیگر سیاست دانوں کے خلاف بھی بلا امتیاز کارروائی شروع ہوئی تو ایک ایک کر کے سب کرپشن کے جرم میں نااہل ہوتے گئے۔ جب اس کی پارٹی کا احتساب شروع ہوا جس نے کرپشن کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا تھا وہاں بھی ایک سے بڑھ کر سیاسی لیڈر کرپٹ ثابت ہوا۔خود پارٹی لیڈر بھی کرپٹ نکلا تو فرید نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاست دانوں سے وابستہ اُمیدوں کو خیر باد کہہ دیا۔فوج نے کبھی خود کو احتساب کے لیے پیش نہ کیا۔آخر ایک دن فرید گھر سے باہر کھڑا تھا کہ اس نے دیکھا اس کی گلی کے خاک روب نے صفائی کے بعد گلی کے گٹر کا ڈھکنا کھولا اور اُس میں اُتر گیا۔ یہ گٹر فرید کے گھر کے عین سامنے تھے اور کل سے بند تھا۔اُس خاک روب نے کافی دیر کے بعد گٹر کھول دیا اور گلی میں کھڑا سارا گندا پانی تھوڑی دیر میں گٹر کے اندر چلا گیا۔فرید نے سوچا یہ شخص کتنا عظیم ہے کہ اس نے ہمیں گندگی سے بچانے کے لیے اور اپنے بچوں کو رزقِ حلال کھلانے کے لیے گٹر کی گندگی میں اُترنا قبول کر لیا ہے۔فرید نے اُسے بلایا گلے لگایا پھر اسے گھر لے آیا اور اسے ہاتھ منہ دھلوانے کے بعد ڈرائنگ روم میں لے آیا جہاں ڈنر پر اس نے اہم کاروباری لوگوں کو بلایا ہوا تھا۔ اس نے خاک روب کے بارے میں بتایا اور اس خواہش کا اظہار کیا آج میں ڈنر کسی کرپٹ شخص کے ساتھ نہیں بلکہ ایسے شخص کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں جو شہر میں سب سے قابل عزت ہے۔اس بات پر اس کے تمام دوست اُٹھ کر چلے گئے۔

شرمندگی

نوید کا تعلق اگر چہ چھوٹی سی بستی سید پور سے تھا اور تھا بھی وہ غریب گھرانے کا لڑکا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے فطری طور پر ادیب پیدا کیا تھا۔ شعر کہنے کی اس میں بلا کی صلاحیت تھی۔ اوائل عمری میں ہی اُس نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ وہ فطری طور پر وزن میں شعر کہتا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی اس نے اپنے اساتذہ اور مقامی شعرا کو اپنی خوب صورت غزلوں سے چونکا دیا۔ ایک مشاعرے میں وہاں کے بزرگ شاعر نے بے ساختہ داد کے دوران بار بار کہا نوید تمہارا ٹھکانہ لاہور ہے نوید تمہارا ٹھکانہ لاہور ہے۔ نوید یہ سن کر بہت حیران ہوا۔ کیونکہ اُس نے کبھی لاہور جانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ شہرت کی اس کے اندر خواہش تو تھی مگر ہوس نہیں تھی۔ لہٰذا وہ مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ پھر اچانک گھریلو اور مالی حالات ایسے خراب ہوئے کہ اسے لاہور آنا پڑا۔ وہ گاؤں کا سادہ طبیعت اور درویش منش شاعر تھا۔ لہٰذا ابتدا میں جب اس نے شاعروں سے روابط بڑھائے تو اُسے پتہ چلا یہاں تو گروہ بندیاں ہیں اُسے ادبی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے کسی نے کسی گروپ کی بے ساکھی استعمال کرنا پڑے گی۔ ورنہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ لہٰذا اُس نے جینوئن شاعروں کا ایک گروپ جوائن کر لیا کچھ ہی عرصہ بعد اُسے احساس ہو گیا کہ یہ جینوئن شاعر تو نان جینوئن شاعروں کو پرموٹ کرنے میں لگے ہوئے ہیں صرف معمولی مفادات کے لیے تو اس نے وہ گروہ چھوڑ دیا۔ کیونکہ ادبی حوالے سے اسے بہت نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔ پھر نوید نے نان جینوئن شعرا کا گروپ یہ سوچ کر جوائن کر لیا کہ اُس میں اس کی اہمیت ہوگی اور اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ مگر

کچھ عرصہ بعد اسے یہاں سے بھی مایوسی ہوئی کیونکہ اس گروپ کے شعرا جینوئن شاعر سے خوفزدہ تھے۔ آخر میں اس نے اپنا گروپ بنایا اور وہ تمام داؤ پیچ سیکھے جو ادبی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ جلد ہی اس کی رسائی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا تک ہوگئی۔ شاعر تو وہ اچھا تھا ہی لہٰذا اُسے شہرت بھی مل گئی۔ اُس کی کچھ غزلیں اور اشعار بہت مشہور ہو گئے جنہیں حوالے کے طور پر سنایا اور تقاریب میں پڑھا جاتا۔ اگرچہ وہ بہت محنتی تھا پرائیویٹ جاب کرتا تھا۔ لہٰذا اس محنت سے اس کے معاشی حالات بہتر نہ ہوئے۔ شہرت آگے چل گئی اور اس کے معاشی حالات جوں کے توں رہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ یہ شہرت اُس کے لیے باعث شرمندگی بننے گی۔ کسی اسکول یا کالج کی تقریب میں اگر اسے مہمان خصوصی بلایا جاتا تو کالج کے باہر اس کے انتظار میں گلدستے لیے کھڑے اساتذہ اور طلبا و طالبات اس وقت حیران ہوتے جب وہ رکشہ سے اُترتا اور اُس نے واجبی سا ڈریس زیب تن کیا ہوتا۔ اُسے بھی بہت شرمندگی ہوتی جیسے جیسے شہرت بڑھتی گئی اس کی شرمندگی بھی بڑھتی گئی۔ اب راہ چلتے اسے لوگ پہچاننے لگے تھے اور ان کو نوید کی حالت دیکھ کر حیرت ہوتی اور وہ اس پر ترس کھانے لگے۔ لہٰذا اس نے تقاریب ترک کا فیصلہ کیا اور گمنام راستوں سے گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر آنے جانے لگا۔

حقیقی خوشی

جبران نے رشتوں سے بہت دھوکے کھائے تھے۔ بچپن میں جب وہ ابھی چار سال کا تھا ماں اس کے والد کے جبر سے تنگ آ کر چھوڑ کر چلی گئی۔ سب ہی یہی کہتے تھے وہ کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ زندگی بھر اُسے یہی طعنہ سننا پڑا۔ ماں کی شفقت اور محبت سے محروم جبران پر سوتیلی ماں کی آمد کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ باپ تو پہلے سے قصائی تھا ذرا سی بات پر مارنا پیٹنا معمول تھا۔ اُوپر سے سوتیلی ماں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مرتا کیا نہ کرتا کوئی اور سہارا نہیں تھا سوا سی ظلم وستم کے سائے میں پرورش پائی۔ چچا ماموں اور دیگر رشتے بھی موجود تھے مگر انہوں نے کبھی خبر گیری نہ کی۔ اسکول میں ٹیچرز سے مار پڑتی کیونکہ گھر کے کاموں سے فرصت نہ ملتی تھی اور ٹینشن علیحدہ تھی۔ دوست بھی ایسے ملے جنہوں نے بری صحت کے طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ اُلٹا سزا اور پابندیوں میں اضافہ ہو گیا۔ بچپن میں گزرے تلخ ایام اور یادیں زندگی بھر ذہن پر اثرانداز رہتی ہیں۔ والد کی وفات کے بعد گھر بدر ہونا پڑا ہوٹلوں پر کام کرتے پرائیویٹ تعلیم جاری رکھی تعلیم مکمل کی سرکاری جاب بھی ملی لیکن ہوٹل پر کام کے دوران تلخ تجربات پھر سرکاری جاب کے دوران آفیسرز اور بااثر سیاسی شخصیات کے ساتھ اُلجھاؤ اور تلخ تجربات نے اُسے تقریباً نیم پاگل بنا دیا۔ ایک لڑکی سے محبت بھی ہوگی مگر وہ بے وفا نکلی۔ یہ روگ بھی جبران کی زندگی کو جہنم بنا گیا۔ بالآخر جبران نے ترک دنیا کا فیصلہ کیا۔ وہ اس حد تک کہ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ پرندے پال لیے گھر میں پودے لے آیا۔ طرح طرح کے پھول اُگا لیے۔ مختلف پرندوں اور پودوں سے باتیں کرتا شاعری کرتا دو

کتے رکھ لیے جو انتہائی وفادار تھے یہ سب کرنے کے بعد جبران کی زندگی میں بڑی خوش گوار تبدیلی آئی اور وہ زندگی کی اصلی خوشیوں کا راز پا گیا۔ جبران کو یقین ہو گیا کہ اگر انسان فطرت کے ساتھ اپنا پرانا تعلق بحال کر لے تو حقیقی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا

==============================

شہلا کو اپنے حسن پر کافی ناز تھا۔ گلی کے سب لڑکے اس کے دیوانے تھے۔ مگر وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ یونیورسٹی میں بھی اُس کے حسن کے چرچے تھے۔ جب کبھی گھر سے نکلتی شاپنگ کے لیے یا کسی اور کام سے تو جو بھی اُسے دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کیا کنوارے کیا شادی شدہ کیا شریف زادے اور کیا باریش زاہد پرہیزگار وہ سرتاپا حسن کا پیکر تھی۔ وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی ذہین باشعور اور تعلیم یافتہ بھی۔ اُس کا جمالیاتی شعور بہت گہرا تھا۔ اسے مشکل سے ہی کوئی چیز پسند آتی تھی۔ وہ اپنے لیے کسی عام لڑکے کا انتخاب کیسے کرسکتی تھی۔ لہٰذا بڑی مشکل سے ہی اُسے ایم فل کی کلاس میں ایک لڑکا اچھا لگا۔ وہ بھی بالکل اُس کی طرح خوش رو، ذہین اور سمارٹ تھا۔ لہٰذا دونوں میں دوستی ہو گئی۔ شہلا کو اس لڑکے کے ساتھ دیکھ کر ان تمام لڑکوں کو بڑی تکلیف ہوئی جو اُس کو دل دے بیٹھے تھے۔ اس کا پیچھا کرتے تھے۔ ایک دو نے تو رشتہ کے لیے بھی اپنے امی ابو کو شہلا کے گھر بھیجا تھا۔ مگر اس کے گھر والوں نے صاف کہہ دیا تھا۔ ہم تو شہلا کی شادی وہاں کریں گے جہاں وہ چاہے گی شہلا ان سب باتوں کو نارمل لے رہی تھی اور اپنے کلاس فیلو انور کے ساتھ اس کی محبت روز بہ روز بڑھتی جارہی تھی۔ اسی اثنا میں علاقے کے بہت بڑے بزرگ پیر سائیں رحمت علی کے گدی نشین سائیں برکت علی کی نظر شہلا پر پڑ گئی تو انھوں نے شہلا کو حاصل کرنے کے لیے کوشش شروع کردی۔ علاقے میں ان کا نام تھا عزت تھی۔ مگر پس پردہ وہ چور، ڈکیت اور قبضہ گروپ تھا۔ انکار سننا ان کی سرشت

میں نہیں تھا۔ سائیں برکت علی نجانے کتنی معصوم لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا تھا۔ اگر کسی نے آواز اُٹھانے کی کوشش بھی کی تو اُسے ہمیشہ کے لیے دبا دیا گیا۔ سائیں رحمت علی کو جب گھر والوں سے انکار ہو گیا اور خود شہلا نے بھی ان کو کھری کھری سنا دیں تو وہ انتقامی کارروائی پر اُتر آئے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے انور کا روڈ ایکسیڈنٹ کرا دیا جس سے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ سائیں رحمت علی کو اُمید تھی کہ جب انور نہیں ہوگا تو اُن کا راستہ آسان ہو جائے گا۔ مگر شہلا نے تو گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ یہ صدمہ وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اوپر سے اسے سائیں رحمت علی کی جانب سے بہت تنگ کیا جا رہا تھا۔ ایک دن وہ ہسپتال انور کی حالت دیکھنے جا رہی تھی کہ سائیں نے اسے گھیر لیا اور اسے لالچ دینے لگے کہ اگر وہ ان سے شادی کر لے تو گھر، گاڑی پتہ نہیں کیا کیا لے دیں گے۔ شہلا کے انکار پر سائیں نے کہا چلو ایک رات گزار لو اُس کی جو قیمت ہو بتا دو۔ اس پر شہلا کو غصہ آیا اور اس نے سائیں کے منہ پر تھوک دیا۔ سائیں کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ اس وقت تو وہ چلا گیا مگر کچھ دن بعد پتہ چلا کہ شہلا پر موٹر سائیکل سوار دو لڑکوں نے تیزاب پھینک دیا ہے جس سے اس کا چہرہ بری طرح جھلس گیا ہے۔ شہلا اب بھی زندہ ہے حسرت و یاس کی تصویر بن کر۔ مگر اب وہ سکون و آرام سے بازار جاتی، شاپنگ کرتی اور گھر آتی ہے جو بھی اس کی طرف دیکھتا ہے منہ پھیر لیتا ہے۔

نشانِ عبرت

جمیلہ اُس خستہ مکان کی طرح تھی جو مدتوں سے ویران پڑا ہوا اور اس کی چھت گر چکی ہو۔ زندگی اُسے ایسے دوراہے پر لائی تھی جس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگر اُسے قدیم ظالمانہ رسم ورواج کی بھینٹ ہی چڑھانا تھا تو پھر اسے تعلیم ہی کیوں دی گئی۔ سندھ کا گاؤں مٹھن گوٹھ میں انسان نہیں بھیڑیے بستے تھے اور جمیلہ کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایسے گاؤں میں پیدا ہوئی۔ اُس کی ماں نے اگرچہ کبھی سکول کی شکل نہیں دیکھی تھی مگر اُس کو شوق تھا کہ اس کے بچے تعلیم حاصل کریں۔ بیٹا تو نکما اور نالائق نکلا۔ پانچویں جماعت تک بمشکل پہنچا۔ پھر برے لڑکوں کی صحبت میں پڑ کر تعلیم چھوڑی۔ جمیلہ نے ماں کے خواب کو پورا کرنے کے لیے تعلیم جاری رکھی۔ اُس نے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ اچھے نمبروں سے پاس کر لیا جو کہ مٹھن گوٹھ کے لوگوں اور وہاں کے جاگیرداروں کے لیے سب سے بری خبر تھی۔ انھوں نے جمیلہ کی اس کامیابی کو اپنے گاؤں کے لیے بدنامی سمجھا۔ اس سے زیادہ بری خبر یہ تھی کہ جمیلہ نے گھر میں بچوں اور بچیوں کو تعلیم دینا شروع کر دی اور وہ بھی بغیر کسی فیس کے۔ جس کی وجہ سے گاؤں کے بچوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ تعلیم کے مخالف تاک میں تھے کہ کوئی موقع ملے تو یہ سلسلہ بند کیا جائے۔ کیونکہ غریبوں کے بچے پڑھ گئے تو انہیں شعور آ جائے گا اور پھر ان کی نمبرداری یا جاگیرداری نہیں چلے گی۔ انھوں نے پہلے تو جمیلہ کے جاہل بھائی کو جال میں پھنسایا اور اس کے ہاتھوں گاؤں کی لڑکی کا ریپ کرا دیا۔ یہ خبر مٹھن گوٹھ پر بجلی بن کر گری۔ کیونکہ یہ سب سے بڑا جرم گردانا جاتا ہے۔ کیونکہ لڑکی گاؤں کی مشترکہ عزت ہوتی ہے۔ لہٰذا

معاملہ تھانہ کچہری میں لے جانے کی بجائے پنچایت بٹھائی گئی جس میں سب وہی نمبردار اور جاگیردار تھے جو تعلیم کے مخالف تھے۔ لہٰذا انھوں نے بڑی سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ جمیلہ کے بھائی کے جرم کی سزا جمیلہ کو ملے گی اور جس لڑکی سے ریپ ہوا ہے اُس کا بھائی جمیلہ کا ریپ کرے گا۔ یہی پنچایت کا متفقہ فیصلہ تھا اور اسی فیصلے کے ذریعے ہی جمیلہ کو تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کا سبق سکھایا جاسکتا تھا۔ لہٰذا بھری پنچایت میں اُسے بالوں سے پکڑ کر لایا گیا۔ اُس کی ماں چیختی چلاتی رہی۔ خدا کے لیے اور پنجتن پاک کے واسطے دیتی رہی۔ جمیلہ خود حیران ششدر تھی اور خوف اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا۔ اس نے احتجاج کیا تو اس کو بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پورے گاؤں کے سامنے اس لڑکی کا بھائی جمیلہ کو کھیتوں میں لے گیا اور کالک اُس کے منہ پر مل دی۔ جمیلہ کو نشانِ عبرت بنا دیا گیا تاکہ کل کو کوئی لڑکی ایسی جرات نہ کر سکے۔ جمیلہ کئی دن تک ویران آنکھوں سے خالی آسمان تکتی رہی۔ وہ مجبور تھی، بے بس تھی کمزور تھی مگر جاہل نہیں تھی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اب ان ظالموں کو عبرت کا نشان بنا دے گی۔ اس نے گاؤں میں بیٹھ کر تمام میڈیا چینلز کو خطوط لکھے اور پورے واقعے کی روداد تفصیل سے لکھی۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ میڈیا چینلز کی گاڑیوں کے رُخ مٹھن گوٹھ کی طرف تھے اور انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح اس واقعہ کو عوام کے سامنے پیش کیا کہ سرکاری مشینری حرکت میں آگئی۔ سب نمبردار اور جاگیردار پکڑے گئے اور پھر انہیں جلد سزا بھی مل گئی۔ جمیلہ کی زندگی تباہ ہوگئی تھی مگر وہ مطمئن تھی کہ آئندہ اس گاؤں میں کسی لڑکی کے ساتھ یہ زیادتی کبھی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس نے واقعی اپنی تعلیم کی طاقت سے مجرموں کو نشانِ عبرت بنا دیا تھا۔

کرشمہ یوں بھی ہوتا ہے

حماد سائیکل پر سوار بہت اچھے موڈ میں تھا۔ منہ میں کچھ خوشی کے نغمے گنگناتے ہوئے سڑک کے ایک پار وہ ہر چیز سے بے نیاز اپنے سپنوں میں گم تیز تیز سائیکل چلاتا ہوا اپنے گھر کی جانب رواں دواں تھا کہ اچانک اُسے خیال آیا کہ اپنی ننھی منی بچی کے لیے کپڑے جوتے چوڑیاں مہندی وغیرہ خرید چکا تھا۔ بیوی کے لیے بھی اس کی من پسند چیزیں خرید چکا تھا لیکن وہ بیوی کے لیے چوڑیاں جو کہ ہر عید پر اسپیشل سات رنگوں پر مشتمل اپنی پسند سے لیتا تھا اور اسے اپنے ہاتھوں سے پہنا تا تھا وہ چوڑیاں تو بھول ہی گیا۔ او ہو اُسنے اچانک سائیکل موڑی لیکن بدقسمتی سے ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکڑ کھا گئی۔ اُس کی سائیکل اور تمام سامان چکنا چوڑ ہو گیا۔ وہ دھڑام سے دور جا گرا۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا لیکن وہ گاڑی والا آناً فاناً غائب ہو چکا تھا۔ حماد کو کچھ ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے سارے خواب بکھر چکے تھے۔ مہینہ بھر کی کمائی سے بچت کر کے ہر ماہ عید کے لیے پیسے جوڑتا تھا اور یہ عید کا تہوار ہی تو تھا جس پر وہ اپنی بیوی اور بچی کو کئی خوشیاں دینا چاہتا ہوتا تھا۔ دریا اُس کی آنکھوں میں اُمڈ آیا تھا۔ وہ آسمان کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگا۔ اُس کی ٹانگ اور بازو زخمی ہو چکے تھے۔ ماتھے پر بھی زخم کے آثار نمایاں تھے۔ اچانک ایک آدمی لوگوں میں سے آیا جو کہ اس کے اردگرد تھے۔ اس آدمی نے اس کو سہارا دے کر اُٹھایا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ مرہم پٹی وغیرہ کروا کر اُسے ایک پانچ لاکھ کا چیک دے دیا اور کہا کہ آج میرا دل مطمئن ہوا ہے کہ میں نے بھی کوئی اچھا کام کر دیا۔ یہ ایک چھوٹی سی نیکی میں تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنا ضمیر

مطمئن کرنے کے لیے کی ہے۔ دراصل میں نے ایک شخص کے پانچ لاکھ دینے تھے لیکن وہ مر گیا۔ اُس کے آگے پیچھے رشتہ داروں بیوی بچوں کا بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ پچھلے پانچ سالوں سے میں پریشان تھا۔ آج اس کے نام پر تمہیں دے دیے کہ شاید میری خلاصی ہو سکے۔ تم عید پر جو لینا چاہتے ہو لے لو اور موٹر سائیکل بھی لے لینا۔ یہ کہہ کر اُس شخص نے حماد کو اُس کے گھر ڈراپ کیا اور چلا گیا۔ حماد حیرت میں ڈوبا ہوا اُس کے دور تک تکتا چلا گیا۔ یہ کوئی فرشتہ تھا یا اللہ کی کوئی خاص کرم نوازی لیکن اُس کی مسیحائی سے اُس کے برسوں کے زخم بھر گئے تھے۔ وہ اللہ کے آگے سر بہ سجود ہوا اور ڈھیروں دفعہ شکر ادا کیا اُس کو اپنے تازہ زخم بھی بھول گئے تھے۔ یقیناً یہ کوئی معجزہ تھا۔

انوکھا روپ چاہت کا

ناظم اپنی بیوی نوشی سے بہت پیار کرتا تھا اور نوشی بھی اس پر جان چھڑکتی تھی۔ کروڑوں کی جائیداد کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی تھی۔ جو شاید دونوں کو کھلتی تھی لیکن کبھی وہ مایوس نہیں ہوئے تھے اور اپنی خوشیوں اور خوشحال زندگی میں مگن ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ یہ بے اولاد جوڑا دنیا میں ایک مثال تھا۔ رشتہ داروں کی چہ میگوئیوں کی دونوں کو کوئی پروا نہ تھی۔ ناظم بھی نوشی کو اس کرب کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔ دونوں ہر ہفتہ اور اتوار کسی سیر گاہ پر گزارتے اور قدرت کے مناظر پر جی کھول کر داد دیتے۔ دن یونہی ہنسی خوشی گزر رہے تھے۔ نوشی کو پہاڑوں پر جانے کا سیر و تفریح کا شوق بھی تھا اور اکثر وہ جایا بھی کرتے تھے۔ اس بار بھی ان کا چند ایسے ہی مناظر دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ وہ ہر مرتبہ ایک نئی جگہ کا انتخاب کرتے تھے۔ وہ وقت بھی آ گیا کہ وہ ایک اونچی پہاڑی پر کھڑے ہنسی مزاق میں مشغول تھے۔ وہ ہر مقام پر جب جاتے تو تجدید محبت کرتے تھے۔ آج اچانک نہ جانے ناظم کے دل میں کیا آئی کہ وہ نوشین سے بولا کہ نوشی یار میں تم سے اتنا پیار کرتا ہوں اگر تم کہو تو میں اس پہاڑ سے نیچے کودنے میں لحہ بھر دیر نہ کروں۔ تم پر قربان ہو جاؤں۔ نوشی بہت شوخ و چنچل سی لڑکی تھی۔ اُس نے مذاق میں فوراً کہا کہ اچھا چلو ٹھیک ہے لگا دو۔ اگلے ہی لمحے نوشی کی چیخیں آسمان کو ہلا دینے کے لیے کافی تھیں۔ ناظم قربانی دے چکا تھا۔ نوشی سکتے میں آ گئی مگر اچانک وہ پہاڑ کی چوٹی پر لیٹ کر ہاتھ نیچے لہرانے لگی۔ ناظم...... ناظم میرا ہاتھ پکڑو اور اوپر آ جاؤ۔ میں تو مذاق............

یہ الفاظ ابھی اس کے ہونٹوں پر ہی تھے کہ اس کی روح بھی پرواز کر گئی۔ اُس کی آنکھیں پہاڑ سے نیچے دیکھ رہی تھیں۔